Registered No. L. 4186

صفر ۱۳۶۰ھ

جلد ۱۸ — عدد

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک - پونچھ روڈ - لاہور

قیمت سالانہ ۵ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

ماہ صفر ۶۰ھ (مطابق اپریل ۴۱ء) جلد ۱۸- عدد ۲

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس بکلر روڈ میں طبع ہوکر
دفتر ترجمان القرآن پونچھ روڈ- مبارک پارک لاہور سے شائع ہوا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اشارات

دنیا میں اِس وقت بڑے زور کے ساتھ توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے۔ یہ ہم نہیں جانتے کہ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا، اہلِ زمین کو محض انکے کرتوتوں کی سزا ہی دینے کا ارادہ کیا گیا ہے یا اس توڑ پھوڑ کے بعد کوئی صالح چیز بھی بننے والی ہے۔ مگر ظاہر آثار سے اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ نوعِ انسانی کی امامت اب تک جس تہذیب کے علمبرداروں کو حاصل رہی ہے، اسکی عمر پوری ہو چکی ہے، اُن کے امتحان کا زمانہ خاتمہ پر آلگا ہے، اور سنت اللہ کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ انکو اور انکی اس جاہلی تہذیب کو دنیا کے انتظام سے بے دخل کر دیا جائے۔ انکو زمین پر کام کرنے کا جتنا موقع ملنا تھا، مل چکا۔ وہ اپنے تمام اوصاف، اور اپنی تمام چھپی ہوئی قابلیتوں کا پورا پورا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ اُنکے اندر شاید اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی ہے جو باہر نہ آچکی ہو۔ لہذا غالب گمان یہی ہے کہ عنقریب وہ میدان سے ہٹائے جانے والے ہیں، اور یہ زبردست شکست و ریخت اسی لیے ہو رہی ہے کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مراسم تجہیز و تدفین ادا کر دیں۔ اسکے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا میں پھر ایک ظلمت کا دور شروع ہو جس طرح آخری اسلامی تحریک کے زوال اور موجودہ جاہلی تہذیب کی پیدائش کے درمیان گذر چکا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی ٹوٹ پھوٹ کے دوران میں کسی نئی تعمیر کی صورت نکل آئے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت، قومی اجتماعیت (نیشنل سوشلزم) اور اشتراکیت (کمیونزم) کی جو طاقتیں اس وقت آپس میں متصادم ہیں، یہ دراصل الگ الگ تہذیبیں نہیں ہیں کہ انکے درمیان انتخاب، اور ان میں سے بہتر کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہو۔ حقیقت میں یہ ایک ہی تہذیب کی تین شاخیں ہیں۔ ایک ہی تصور انسان، ایک ہی تصور کائنات، ایک ہی نظریۂ حیات اور ایک ہی اساس اخلاق ہے جس پر ان تینوں کی تعمیر ہوئی ہے۔ انسان کو حیوان سمجھنا، دنیا کو بے خدا فرض کرنا، علوم طبیعی سے انسانی زندگی کا قانون اخذ کرنا، اور اخلاق کی بنا تجربہ و مصلحت پر رکھنا، یہ ان سب کی مشترک بنیاد ہے۔ ان کے درمیان فرق صرف اس حیثیت سے ہے کہ اِس جاہلی تہذیب نے سب سے پہلے فرد کی آزادی اور قوموں کی انفرادیت کا بیج بویا تھا جس سے قومی ریاستوں کے ساتھ سرمایہ دارانہ جمہوریت پیدا ہوئی اور مدتہائے دراز تک انسانیت کو تباہ و برباد کرتی رہی۔ پھر جب اس کے ظلم و ستم سے انسانی مصائب حد کو پہنچ گئے تو اسی تہذیب نے اشتراکی انقلاب کو بطور علاج پیش کیا، مگر بہت جلدی ظاہر ہو گیا کہ یہ علاج اصل مرض سے بھی زیادہ تباہ کن ہے۔ آخر کار وہی تہذیب پھر ایک دوسری تجویز سامنے لائی جس کا نام فاشزم یا نیشنل سوشلزم ہے اور چند سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اس ام الخبائث کا یہ آخری بچہ فتنہ انگیزی و شرر باری میں پہلے دونوں برخورداروں سے بھی بازی لے گیا ہے۔

اب دنیا کے لیے اُس تہذیب کو اور زیادہ آزمانے کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے جو آدمی کو جانور سمجھ کر، اور اس جانور کو بے لگام فرض کر کے اپنا کام شروع کرتی ہے اور اسکے اندر جوع البقر سے لیکر بدترین قسم کی درندگی تک ہر وہ بیماری پیدا کر دیتی ہے جو آدمیت کے حق میں نہایت مہلک ہے۔ درحقیقت یہ پوری تہذیب اپنی تمام شاخوں سمیت عمر طبعی کو پہنچ چکی ہے، امتحان کی مدت ختم کر چکی ہے، اس کے پاس اب کوئی اور انجھر ایسا باقی نہیں رہا ہے جس کو یہ انسانی مسائل کے حل کی حیثیت سے پیش کر سکے، اور بالفرض اگر یہ اپنی زندگی کی مہلت بڑھانے کے لیے کسی اور "ازم" کی تخلیق کا بہانہ کرے بھی تو خدا کی مشیت

یہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اسے اپنی زمین کو فساد سے بھرنے کا کوئی اور موقع دیگا۔ بہت ممکن ہے کہ موجودہ تصادم کے بعد اسکی شاخوں میں سے کوئی ایک شاخ باقی رہ جائے مگر یقیناً اُس کا بقار عارضی ہوگا جلدی ہی وہ شاخ خود بخود کر اپنے اندر سے آگ جھاڑیگی اور آپ اپنی آگ ہی سے جل کر خاک ہو جائیگی۔

اب رہا یہ سوال کہ آیا اس تہذیب کی تباہی کے بعد دنیا میں پھر کوئی ظلمت کا دور آتا ہے یا کوئی نئی تعمیر شروع ہونی ہے، تو اس کا فیصلہ دو چیزوں پر منحصر ہے:

ایک یہ کہ جاہلیت خالصہ کی ناکامی کے بعد کوئی اور ایسا نظریہ انسان کو ملتا ہے یا نہیں جو پچھلے فاسد نظریوں سے بہتر ہو، جس سے انسانی عقل صلاح کی توقعات وابستہ کرسکے اور جس پر ایک جاندار اور طاقتور تہذیب قائم ہوسکتی ہو۔

دوسرے یہ کہ نوع انسانی میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جسکے اندر جہاد اور اجتہاد کی وہ صلاحیتیں اور قوتیں ہوں جو ایک نئے نظریہ پر ایک نئی تہذیب کا قصر تعمیر کرنے کے لیے ضروری ہیں، اور جسکے اخلاق و اوصاف اُن لوگوں سے مختلف ہوں جنکی خباثت و شرارت کا ابھی قریب ہی میں انسان کو تجربہ ہو چکا ہے۔

اگر ایسا کوئی نظریہ بروقت سامنے آجائے اور اسکو لے کر ایک صالح جماعت اٹھ کھڑی ہو تو یقیناً نوع انسانی ایک دوسرے دور ظلمت سے بچ سکتی ہے، ورنہ کوئی قوت اسکو اس تاریک گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی۔ یہ صدمۂ عظیم جس سے انسانیت اس وقت دوچار ہے، یہ بھیڑیوں سے بدتر سلوک جو اس وقت آدمی آدمی کے ساتھ کر رہا ہے، یہ بے دردی و سنگدلی جو کبھی دور وحشت میں بھی آدمی سے ظاہر نہیں ہوئی تھی، یہ بے رحمی و قساوت جسکی نظیر درندہ جانور بھی پیش کرنے سے عاجز ہیں، یہ علم و حکمت کے نتائج جو آج جہاں سوز طیاروں اور انسان پاش ٹینکوں کی شکل میں دیکھے جا رہے ہیں، یہ تنظیمی قابلیتوں کے ثمرات جنہوں نے آج غارت گر فوجوں کی صورت اختیار کی ہے، یہ صنعتی ترقی کے پھل جو آج آلات جنگ کی

بھیانک شکل میں نمودار ہو رہے ہیں، یہ وسائل نشر و اشاعت کا کمال جس سے آج دنیا میں جھوٹ پھیلانے اور قوموں میں منافرت کے بیج بونے کا کام لیا جا رہا ہے، یہ سب کچھ انسان کا دل توڑ دینے اور اسکو اپنے آپ سے اور اپنی ساری قابلیتوں اور صلاحیتوں سے مایوس کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے، اور اس کا فطری نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ نوع انسانی دل شکستہ و مایوس ہو کر صدیوں کے لیے نیند اور بے ہوشی کی حالت میں مبتلا ہو جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں، انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور ایک صالح جماعت کا برسرکار آنا ہے۔

مگر وہ کونسا نظریہ ہو سکتا ہے جس کے لیے آج کامیابی کا کوئی موقع ہو؟

مشرکانہ جاہلیت جس پر دنیا کی بہت سی قدیم تہذیبیں قائم ہوئی تھیں، اب اسکے احیاء کا کوئی امکان نہیں۔ شرک کی جڑ کٹ چکی ہے۔ جاہل عوام پر چاہے اس کا تسلط ابھی باقی ہو، مگر علم و عقل رکھنے والے لوگ اب اس وہم میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ کائنات کے نظام کو بہت سے خدا چلا رہے ہیں، اور انسان کی فلاح و سعادت کا سررشتہ دیوتاؤں یا روحوں سے وابستہ ہے۔ علاوہ بریں یہ حقیقت ہے کہ مشرکانہ نظریہ سے انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ پیچیدگیاں کچھ اور بڑھ جاتی ہیں۔ سب سے بڑی مشکل جس نے اس وقت دنیا کو پریشان کر رکھا ہے، نوع انسانی میں وحدت کا فقدان ہے۔ مگر شرک اس مشکل کو حل نہیں کرتا، بلکہ وحدت پیدا کرنے کے بجائے مزید تفریق و تقسیم کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا کسی مشرکانہ نظریہ کے لیے آج دنیا میں برسر اقتدار آنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

راہبانہ جاہلیت دنیا میں کبھی کوئی طاقت نہ تھی نہ بن سکتی ہے۔ کرما اور تناسخ اور راہبنا اور ہمہ اوست کے نظریات، جو روح کو سرد اور ہمتوں کو پست اور قوائے فکریہ کو افیونِ تخیل کی پینک میں مست

کر دینے والے ہیں، اپنے اندر اتنی جان ہی نہیں رکھتے کہ انکے بل پر کوئی ایسی تہذیب پیدا ہو سکے جو زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہو اور دنیا کی امامت و پیشوائی کے منصب جلیل پر فائز ہو سکتی ہو۔ کوئی سامری اس تنِ مردہ میں روح پھونکنے کی جتنی چاہے کوشش کر دیکھے، یہ نظریات کبھی گیان اور تیاگ اور تپسیا کے مقام سے آگے بڑھ کر ایک صالح تمدن کی تخلیق اور ایک عادل مملکت کی تاسیس اور ایک درخشاں تہذیب کی تعمیر تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہذا مردہ اور روبزوال قومیں تو ان نظریات کے چکر میں پڑی رہ سکتی ہیں مگر کسی زندہ اور ابھرنے والی قوم کے تخیل کو یہ کبھی اپنی طرف نہیں کھینچ سکینگے

رہی جاہلیت خالصہ تو اس کا اور اسکی پیداوار کا اب دنیا کو اتنا کافی تجربہ ہو چکا ہے کہ عنقریب وہ اس سے مایوس ہونے والی ہے۔ انسان کا اپنے آپکو جانور فرض کرنا، جانوروں کی زندگی سے تنازع للبقاء اور انتخاب طبیعی اور بقائے اصلح کا قانون اپنے لیے اخذ کرنا، مادّی فوائد اور لذتوں کو مقصودِ حیات ٹھیرانا، تجربات اور مصالح کو اخلاق کا ماخذ قرار دینا، اور کسی فوق الانسانی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم نہ کرنا جو کچھ نتائج پیدا کر سکتا تھا وہ سب اپنی تمام تلخیوں کے ساتھ سامنے آچکے ہیں۔ ان نظریات کی بدولت انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ قومی اور نسلی تعصبات ہیں، رنگ و نسل کی برتری کے دعوے ہیں، قومی ریاستوں کی معاشی و سیاسی رقابتیں ہیں، قیصریت اور استعمار اور معاشی لوٹ کے فتنے ہیں، افراد سے لیکر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں تک کا اپنے معاملات میں ہر اخلاقی قید سے آزاد ہو جانا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کا واقعی جانور بنکر کام کرنا اور دوسرے انسانوں کے ساتھ جانوروں کا سا بلکہ بے روح مشینوں کا سا سلوک کرنا ہے۔ یہ نظریات اگر جمہوریت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو ظلم اور کسبِ حرام اور فحش اور بے حیائی کی آزادی ملتی ہے۔ اور اگر اشتراکیت یا اجتماعیت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو بھیڑ بکریوں کے گلّے کی طرح ایک ڈکٹیٹر یا ایک چھوٹی سی پارٹی کے حوالہ کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ انہیں جس طرح چاہے ہانکے اور اُن کا جو کچھ چاہے بنائے۔ یہ پھل جو ان نظریات سے پیدا ہوئے

ہوئے ہیں، کسی اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اس شجر خبیث کی عین فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے یہ پھل پیدا ہوں - لہٰذا جس طرح اب تک انسان اس سے کسی قسم کی فلاح نہیں پا سکا ہے اسی طرح آئندہ بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انسانیت کے اس حیوانی تصور اور کائنات کے اس مادّہ پرستانہ نظریے اور اخلاق کی اس تجربی اور مصلحت پرستانہ بنیاد پر کوئی ایسا اجتماعی مسلک پیدا ہو سکے گا جو انسان کے لیے موجب فلاح ہو -

---

ان سب نظریات کی ناکامی کے بعد اب دنیا اگر کسی نظریہ سے فلاح کی امیدیں وابستہ کر سکتی ہے تو وہ صرف ایک ایسا نظریہ ہی ہو سکتا ہے :

جو انسان کو انسان قرار دے نہ کہ جانور، جو اپنی ذات کے متعلق انسان کی رائے کو بہتر بنائے جس کا تصورِ انسانیت مغربی سائنس کے "تصورِ حیوانی"، اور مسیحیت کے "پیدائشی گنہگار" اور ہندویت کے "مجبور تناسخ" سے بلند تر ہو -

جو انسان کو مختارِ مطلق اور شترِ بے مہار نہ بنائے بلکہ اسے سلطان کائنات کے اقتدارِ اعلیٰ کا تابع قرار دے اور اس کے آگے ذمہ دار و جواب دہ ٹھیرائے ،

جو اخلاق کے ایک ایسے قابل عمل ضابطہ کا انسان کو پابند بنائے جس میں اپنی خواہشات کے مطابق ردوبدل کرنے کا حق اس کو نہ ہو ،

جو مادّی بنیادوں پر انسانیت کو تقسیم کرنے کے بجائے ایک ایسی اخلاقی و روحانی بنیاد فراہم کرے جس پر انسانیت متحد ہو سکتی ہو ،

جو اجتماعی زندگی کے لیے ایسے اصول انسان کو دے جن پر افراد اور جماعتوں اور قوموں کے درمیان صحیح اور متوازن عدل قائم ہو سکے ،

جو زندگی کے نفس پرستانہ مقاصد سے بلند تر مقاصد اور قدر و قیمت کے مادّہ پرستانہ معیاروں سے بہتر معیار انسان کو دے،

اور ان سب خصوصیات کے ساتھ، جو علمی و عقلی اور تمدنی ارتقاء میں انسان کی صرف مددہی نہ کرے بلکہ صحیح رہنمائی بھی کرے اور مادی و اخلاقی، ہر دو حیثیتوں سے اسکو ترقی کی طرف لے جائے۔

ایسا ایک نظریہ دنیا میں اسلام کے سوا اور کونسا ہے؟ لہٰذا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے کہ اب انسانیت کا مستقبل اسلام پر منحصر ہے۔ انسان کے اپنے خود ساختہ تمام نظریات ناکام ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی کے لیے اب کامیابی کا کوئی موقع نہیں۔ اور انسان میں اب اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ پھر کسی نئے نظریہ کی تصنیف اور اسکی آزمائش پر اپنی قسمت کی بازی لگا سکے۔ اس حالت میں صرف اسلام ہی ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جس سے انسان فلاح کی توقعات وابستہ کر سکتا ہے، جس کے لیے نوع انسانی کا دین بن جانے کا امکان ہے، اور جسکی پیروی اختیار کر کے انسان کی تباہی ٹل سکتی ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیا میں مفتوح ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہے، اسلام کی خوبیوں پر ایک وعظ اور اس پر ایمان لانے کے لیے ایک دعوت نامہ شائع ہونے کی دیر ہے، پھر ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ سب مسخر ہوتے چلے جائینگے۔ ایک تہذیب کا سقوط اس طرح اچانک نہیں ہوا کرتا کہ کل تھی اور آج ناپید ہو گئی۔ اور دوسری تہذیب کا قیام بھی اس طرح واقع نہیں ہوتا کہ آج چٹیل میدان ہے اور کل کسی منتر کے زور سے ایک عالیشان قصر بن کھڑا ہو۔ گرنے والی تہذیب کے افکار، اصول، طریقے مدتہائے دراز تک دلوں اور دماغوں پر، علوم و آداب پر اور تمدن و معاشرت پر اپنا اثر جمائے رہتے ہیں۔ اس اثر کا استیصال خود بخود نہیں ہو جاتا، کرنے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح گرنے والی تہذیب کے علمبردار بھی زوال پذیر ہونے کے باوجود سالہا سال تک زمین پر قبضہ جمائے رہتے

ہیں۔ وہ خود جگہ چھوڑ کر نہیں ہٹ جاتے، ہٹانے سے ہٹتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس نئی تہذیب پر نئی عمارت بنانا بھی کوئی کھیل نہیں ہے کہ آپ سہولت سے بیٹھے رہیں اور وہ خود بن جائے۔ اس کام کے لیے ایک زبردست تنقیدی، تخریبی اور تعمیری تحریک کی ضرورت ہے، جو ایک طرف علم و فکر کی طاقت سے پرانی تہذیب کی جڑیں اکھاڑ دے اور دوسری طرف علوم و فنون و آداب کو اپنی مخصوص فکری بنیادوں پر از سر نو مدوّن کرے حتی کہ ذہنی دنیا پر اس طرح چھا جائے کہ لوگ اسی کے طرز پر سوچنا اور محسوس کرنا شروع کردیں، ایک طرف ان پرانے سانچوں کو ڈھائے جن پر انسانیت ڈھلا کرتی تھی اور دوسری طرف نئے سانچے تیار کرے جن سے نئے اخلاق اور نئی سیرتوں کے آدمی ڈھلنے لگیں، ایک طرف پرانے نظام تمدن و سیاست کو بزور مٹائے اور دوسری طرف ایک پورا نظام تمدن و سیاست اپنے اصولوں پر عملاً قائم کردے۔

پس دنیا کو آئندہ دور ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں ایک صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اسکے لیے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ انکو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ صرف اسی صورت سے دیا جاسکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اسکے خود مطیع بنیں، جس ضابطہ پر ایمان لاتے ہیں اسکے خود پابند ہوں، جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اسکا خود نمونہ بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اسکا خود التزام کریں، اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اسے خود چھوڑ دیں۔ اسکے بغیر تو انکی صداقت آپ ہی مشتبہ ہوگی کجا کہ کوئی اسکے آگے سر تسلیم خم کرے۔ پھر انکو اس فاسد نظام تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہوگی، اس سے اور اسکے پیروؤں سے تعلق توڑنا ہوگا، ان تمام فائدوں، لذتوں، آسائشوں اور امیدوں کو چھوڑنا ہوگا جو اس نظام سے وابستہ ہوں، اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو نظام غالب کے خلاف بغاوت کرنیکا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہوگا، اپنے اوقات عزیز بھی صرف کرنے پڑینگے، اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑیگا، قید اور جلاوطنی اور ضبطی اموال

اور تباہی اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہونگے اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی پڑینگی۔ ان راہوں سے گذرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہوا ہے نہ اب ہو سکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو محض نظریہ خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ ہو، کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑیں نہیں پھیلا سکتا۔ نظریہ کی کامیابی کے لیے خود اسکے اصول کی طاقت جسقدر ضروری ہے، اسیقدر اُن انسانوں کی سیرت، اُنکے عمل، اور اُنکی قربانی و سرفروشی کی طاقت بھی ضروری ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ زراعت کے طریقہ کی درستی، بیج کی صلاحیت، موسم کی موافقت سب اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں مگر زمین اتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کسان اپنے صبر سے، اپنی محنت سے، اپنے بہتے ہوئے پسینہ سے، اور اپنی جفاکشی سے اس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا، وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی اُگلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

اگرچہ خلوص ایمان اور قربانی و جانفشانی ہر دین کے قیام کے لیے ناگزیر ہے، خواہ وہ دینِ حق ہو یا دینِ باطل۔ مگر دینِ حق اُس سے بہت زیادہ اخلاص اور قربانی مانگتا ہے جو دینِ باطل کے قیام کے لیے درکار ہے۔ حق ایک ایسا باریک بین صراف ہے جو ذراسی کھوٹ کو بھی قبول کرنیکے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ خالص سونا چاہتا ہے تاکہ آزمائشوں کی بھٹی میں سے گذر کر جب تک ساری کھوٹ جل نہ جائے اور پورے عیار کا کندن نکل نہ آئے وہ اپنے نام سے اسکو بازار میں لانے کی ذمہ داری لینا پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ حق ہے، باطل نہیں ہے کہ کھوٹے سکے اور ملمع کیے ہوئے زیور بیچتا پھرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے:

مَاكَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (آل عمران - ۱۸)

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان لانے والوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے جس پر تم لوگ اس وقت ہو (کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں) وہ نہ مانیگا جب تک کھوٹے کو کھرے سے الگ نہ کر دے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ، وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۔ (عنکبوت - ۱)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہدینے پر کہ ہم ایمان لائے، چھوڑ دیے جائینگے اور انہیں آزمائش کی بھٹی میں تپایا نہ جائیگا حالانکہ ان سے پہلے جو گذرے ہیں (یعنی جنہوں نے بھی ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے) وہ ضرور تپائے گئے ہیں۔ ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً (التوبہ-۲)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم سستے چھوڑ دیے جاؤگے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا اور اللہ اور رسول اور اہلِ ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتّٰى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (بقرہ-۲۶)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا داخلہ تمہیں مل جائیگا حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت تو گذری ہی نہیں جو تم سے پہلے (ایمان لانے والوں) پر گذر چکی ہے۔ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتی کہ رسول اور اسکے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئیگی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ وَلَئِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِنْ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ أَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعٰلَمِينَ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِينَ (العنکبوت-۱)

اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، مگر جب اللہ کی راہ میں انہیں ستایا گیا تو انسانوں کی ایذا سے ایسے ڈرے جیسا اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ حالانکہ اگر تیرے رب کی طرف سے فتح نصیب ہوجائے تو یہی لوگ آکر کہینگے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے۔ کیا اللہ اہلِ دنیا کے دلوں کی حالت سے خوب واقف نہیں ہے؟ مگر ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایمان دار کون ہیں اور منافق کون۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (بقرہ-۱۹)

ہم ضرور تم کو خطرات اور فاقوں سے اور جان و مال اور کمائیوں کے نقصانات سے آزمائینگے، اور کامیابی کی بشارت دیدو اُن مستقل مزاج لوگوں کو جنہوں نے ہر مصیبت کی آمد پر کہا کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور آخر اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ ایسے لوگوں پر انکے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ راہ راست پانے والے ہیں۔

قرآن یہ سب کچھ کہنے کے ساتھ اس حقیقت پر بھی متنبہ کر دیتا ہے کہ

وَلَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِيَبْلُوَ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ (محمد-۱)

یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اللہ اپنے باغیوں کی سرکوبی خود نہیں کر سکتا اسلیے تم سے مدد مانگتا ہے۔ نہیں، وہ اتنی زبردست طاقت رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک اشارے میں انکو تباہ کر کے رکھدے اور اپنے دین کو خود قائم کر دے، مگر اس نے یہ جہاد اور محنت اور قربانی کا بار تم پر اسلیے ڈالا ہے کہ وہ تم انسانوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں آزمانا چاہتا ہے۔

جب تک باطل پرستوں سے تمہارا تصادم نہ ہو، اور اس تصادم میں مصائب و شدائد اور خطرات و مہالک پیش نہ آئیں، سچے اہلِ ایمان جھوٹے مدعیوں سے ممیز نہیں ہو سکتے، اور جب تک ناکارہ لوگوں میں سے کارآمد آدمی چھنٹ کر الگ نہ ہو جائیں وہ جتھا نہیں بن سکتا جو خلافت الٰہیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل ہو۔

لہٰذا آج دنیا کا مستقبل درحقیقت اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ کوئی نظریۂ حق انسان کو ملتا ہے یا نہیں، کیونکہ نظریۂ حق تو موجود ہے، البتہ وہ اگر منحصر ہے تو اس امر پر کہ انسانوں میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جو سچے ایماندار، دُھن کے پکے اور اپنی ہر عزیز و محبوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنیوالے لوگوں پر مشتمل ہو۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ اب کہاں مل سکتے ہیں، وہ تو بس ایک مبارک دور میں پیدا ہوئے تھے اور پھر خالق نے اس ماڈل کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔ لیکن یہ محض ایک وہم ہے اور ایسا وہم انہی لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جنہیں خود اپنے آپ سے مایوسی ہے۔ دنیا میں ہر قابلیت اور ہر صلاحیت کے آدمی ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں منافقانہ خصوصیات رکھنے والے اور ضعیف الارادہ لوگ اور سہولت پسند اشخاص ہمیشہ پائے گئے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں، وہاں ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو کسی چیز پر ایمان لانے کے بعد اس کو سربلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا سکتے ہیں۔ آج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک دو نہیں ہزاروں انسان ایسے ہیں جو مثلاً اور جرمنی پر ایمان لائے ہیں اور وہ اپنے اس ایمان کی خاطر ہوائی جہاز سے عین دشمن کے ملک میں جست لگاتے ہیں جہاں انکو معلوم ہے کہ بے شمار شکاری انکی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ روس کا انقلاب جو ابھی چوبیس پچیس سال پہلے ہی کی بات ہے۔ اسکی تاریخ آپ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہزارہا آدمی جو انقلابی نظریات پر ایمان رکھتے تھے مسلسل نصف صدی تک ہر قسم کی قربانیاں کرتے رہے، سائبیریا کے جہنم میں بھیجے گئے، پھانسی پر چڑھائے گئے، جلاوطنی کی حالت میں برسوں ملک ملک کی خاک چھانتے پھرے، اپنی ذاتی خوشحالی کی تمام خواہشوں اور تمناؤں کا خون کیا، خانماں بربادی کو خود اپنے ہاتھوں مول لیا، اور یہ سب کچھ اس وقت کیا جبکہ زار کی سلطنت کے مٹنے کا تصور بھی مشکل ہی کیا جا سکتا تھا۔ دور نہ جائیے، خود ہندوستان ہی کو

دیکھ لیجیے - یہاں جو نوجوان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے کہ کشت و خون کے ذریعے سے وہ اپنے ملک کو آزاد کرا سکینگے انہوں نے اپنے مقصد کے پیچھے اپنی زندگیوں کو برباد کرنے اور خطرات کا مقابلہ کرنے میں کیا کسر اٹھا رکھی؟ کونسی ممکن الوقوع مصیبت ایسی تھی جسے انہوں نے برداشت نہ کیا ہو؟ قید خانوں میں شدید ترین اذیتیں اٹھائیں، حبس دوام میں عمریں گذار دیں، پھانسی کے تختہ پر جانیں تک دیدیں - اس سے بحث نہیں کہ انکے نظریات غلط تھے، مگر اس سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کسی مقصد پر ایمان لانے کے بعد اسکے لیے جان و مال اور شخصی امنگوں کی قربانی گوارا کرنے اور مصیبتیں سہنے کی صفت آج بھی انسانوں میں ناپید نہیں ہے - گاندھی جی کی سول نافرمانی ابھی حال ہی کی بات ہے - کیا اسی ہندوستان کے باشندوں میں ایسے لوگ موجود نہ تھے جنہوں نے لاٹھیاں کھائیں، جیل گئے اور مالی نقصانات برداشت کیے؟ کیا بار دولی کے کسانوں نے اپنی زمینوں، اپنے جانوروں اور اپنے گھر کے برتنوں تک کی قرقی اور نیلام کو صبر کے ساتھ برداشت نہیں کیا؟ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آج ایثار و قربانی کی وہ صفات انسانوں میں مفقود ہیں جو پہلے لوگوں میں پائی جاتی تھیں؟ اگر ہٹلر اور مارکس اور گاندھی پر ایمان لا کر انسان یہ سب کچھ کر سکتا ہے، تو کیا خدا پر ایمان لا کر کچھ نہیں کر سکتا؟ اگر خاک وطن میں اتنی کشش ہے کہ اسکے لیے آدمی جان و مال کی قربانی گوارا کر سکتا ہے تو کیا خدا کی رضا اور اسکے تقرب میں اتنی بھی کشش نہیں ہے؟ پس جو لوگ خود پست ہمت اور ضعیف الارادہ ہیں انہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس کار عظیم کے لیے جن اولوالعزم انسانوں کی ضرورت ہے وہ کہیں مل ہی نہیں سکتے، البتہ اپنی ذات کی حد تک وہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ

محرم کی اشاعت میں جماعت اسلامی کی تشکیل کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اسکو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو حضرات اس نصب العین اور اس طریق کار سے متفق ہیں اور اسکے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں یا کر رہے ہیں وہ دفتر ترجمان القرآن کو اپنے عزم سے مطلع فرمائیں - اب وقت آگیا ہے کہ جہاں جہاں اس فکر کے آدمی موجود ہیں انکے درمیان ربط پیدا کیا جائے اور انکے اجتماع کی کوئی صورت نکالی جائے۔ لہذا اگر ہمیں انکے پتے معلوم ہوں تو ایک اجتماعی ہیئت بنانے میں بڑی سہولت ہو جائیگی - بہت سے حضرات ایسے ہیں جو مقصد سے متفق ہیں اور کام کرنا چاہتے ہیں، مگر صرف یہ دیکھ کر خاموش بیٹھے ہیں کہ بظاہر کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ اب انہیں مہر سکوت توڑنی چاہیے اور اپنے ارادہ کا اظہار کر دینا چاہیے - بہت سے حضرات ایسے بھی ہیں جو اپنی اپنی جگہ اس سلسلہ میں کچھ کام کر رہے ہیں - مگر انہیں سمجھنا چاہیے کہ ایک فکر اور ایک مقصد رکھنے والے لوگوں کا الگ الگ رہنا اصولاً غلط اور عملاً غیر مفید ہے - ایسے سب حضرات اگر دفتر ترجمان القرآن کو ایک واسطہ کی حیثیت سے استعمال کریں تو انکے درمیان رابطہ پیدا ہو سکتا ہے - کیا ہم امید کریں کہ ایسے تمام حضرات غیر ضروری تامل کے بغیر ہمیں اپنے پتوں اور ضروری حالات سے آگاہ فرما دینگے؟

مقالات

اِسلام اور جاھلیّت

[یہ مقالہ ۲۳ر فروری ۱۹۴۱ء کو مجلس اسلامیات، اسلامیہ کالج پشاور کی دعوت پر پڑھا گیا تھا]

انسان کو دُنیا میں جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی وہ کوئی معاملہ اُس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اس چیز کی ماہیّت و کیفیت اور اپنے اور اُسکے باہمی تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر لے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ رائے بجائے خود صحیح ہو یا غلط، مگر بہر حال اسے اِن امور کے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنی ضرور پڑتی ہے۔ اور جب تک وہ کوئی رائے قائم نہیں کر لیتا یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ مَیں اسکے ساتھ کیا طرزِ عمل اور کیا رویّہ (Attitude) اختیار کروں۔ یہ آپکا شب و روز کا تجربہ ہے۔ آپ جب کسی شخص سے ملتے ہیں تو آپکو یہ معلوم کرنیکی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ شخص کون ہے، کس حیثیت، کس مرتبے، کن صفات کا آدمی ہے اور مجھ سے اس کا تعلق کس نوعیت کا ہے۔ اسکے بغیر آپ یہ طے کر ہی نہیں سکتے کہ آپکو اُسکے ساتھ کیا برتاؤ کرنا ہے۔ اگر علم نہیں ہوتا تو بہر حال آپکو قرائن کی بنا پر ایک قیاسی رائے ہی ان امور کے متعلق قائم کرنی پڑتی ہے اور جو رویّہ بھی آپ اُسکے ساتھ اختیار کرتے ہیں اسی رائے کی بنا پر کرتے ہیں۔ جو چیزیں آپ کھاتے ہیں اُنکے ساتھ آپکا یہ معاملہ اسی وجہ سے ہے کہ آپ کے علم یا آپکے قیاس میں وہ چیزیں غذائی ضرورت پوری کرتی ہیں۔ جن چیزوں کو آپ پھینک دیتے ہیں، جنکو آپ استعمال کرتے ہیں، جن کی آپ حفاظت کرتے ہیں،

جنکی آپ تعظیم یا تحقیر کرتے ہیں، جن سے آپ ڈرتے یا محبت کرتے ہیں، اُن سب کے متعلق آپ کے یہ مختلف طرزِ عمل اُسی رائے پر مبنی ہوتے ہیں جو آپ نے اُن چیزوں کی ذوات وصفات اور اپنے ساتھ اُنکے تعلق کے بارے میں قائم کی ہے۔

پھر جو رائے آپ اشیاء کے متعلق قائم کیا کرتے ہیں اُسکے صحیح ہونے پر آپکے رویّہ کا صحیح ہونا اور غلط ہونے پر آپکے رویّہ کا غلط ہونا منحصر ہوتا ہے۔ اور خود اس رائے کی غلطی وصحت کا مدار اس چیز پر ہوتا ہے کہ آیا آپ نے علم کی بنا پر رائے قائم کی ہے، یا قیاس پر، یا وہم پر، یا محض مشاہدۂ حسّی پر۔ مثلاً ایک بچہ آگ کو دیکھتا ہے اور مجرد مشاہدۂ حسّی کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ بڑا خوبصورت، چمکدار کھلونا ہے۔ چنانچہ اس رائے کے نتیجہ میں اُس سے یہ طرزِ عمل ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُسے اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اسی آگ کو دیکھ کر وہم سے یا قیاس سے یہ رائے قائم کرتا ہے کہ اسکے اندر الوہیت ہے، یا یہ الوہیت کا مظہر ہے۔ چنانچہ اس رائے کی بنا پر وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسکے ساتھ میرا رویّہ یہ ہونا چاہیے کہ میں اسکے آگے سرِ نیاز جھکا دوں۔ ایک تیسرا شخص اسی آگ کو دیکھ اسکی ماہیت اور اسکی صفات کی تحقیق کرتا ہے اور علم وتحقیق کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ پکانے اور جلانے اور تپانے والی ایک چیز ہے، اور میرے ساتھ اس کا تعلق وہ ہے جو ایک مخدوم کے ساتھ خادم کا تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ اس رائے کی بنا پر وہ آگ کو نہ کھلونا بناتا ہے نہ معبود، بلکہ اس سے حسبِ موقع پکانے اور جلانے اور تپانے کی خدمت لیتا ہے۔ ان مختلف رویّوں میں سے بچے اور آتش پرست کے رویّے جاہلیت کے رویّے ہیں۔ کیونکہ بچے کی یہ رائے کہ آگ محض کھلونا ہے تجربے سے غلط ثابت ہو جاتی ہے اور آتش پرست کی یہ رائے کہ آگ خود الٰہ ہے یا مظہرِ الوہیت ہے کسی ثبوتِ علمی پر مبنی نہیں بلکہ محض قیاس و وہم پر مبنی ہے۔ بخلاف اسکے آگ سے خدمت لینے والے کا رویّہ علمی رویّہ ہے کیونکہ آگ کے متعلق اُسکی رائے علم پر مبنی ہے۔

زندگی کے بنیادی مسائل

اس مقدمہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب ذرا اپنی نظر کو جزئیات سے کلیات پر پھیلائیے۔ انسان اس دُنیا میں اپنے آپکو موجود پاتا ہے۔ اسکے پاس ایک جسم ہے جس میں بہت سی قوتیں بھری ہوئی ہیں۔ اس کے سامنے زمین و آسمان کی ایک عظیم الشان بساط پھیلی ہوئی ہے جس میں بیحد وحساب اشیاء ہیں اور وہ اُن اشیاء سے کام لینے کی قدرت اپنے اندر پاتا ہے۔ اسکے گرد و پیش بہت سے انسان، حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ ہیں اور ان سب سے اسکی زندگی وابستہ ہے۔ اب کیا آپکے نزدیک یہ متصور ہے کہ وہ ان چیزوں کے ساتھ کوئی رویّہ اختیار کر سکتا ہے جب تک کہ پہلے خود اپنے بارے میں، ان تمام موجودات کے بارے میں، اور انکے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرے؟ کیا وہ اپنی زندگی کے لیے کوئی راستہ اختیار کر سکتا ہے جب تک یہ طے نہ کرے کہ مَیں کون ہوں، کیا ہوں، ذمہ دار ہوں یا غیر ذمہ دار، خود مختار ہوں یا ماتحت، ماتحت ہوں تو کس کا اور جواب دہ ہوں تو کس کے سامنے، میری اس دنیوی زندگی کا کوئی مآل ہے یا نہیں، اور ہے تو کیا ہے؟ اسی طرح کیا وہ اپنی قوتوں کے لیے کوئی مصرف تجویز کر سکتا ہے جب تک اس سوال کا فیصلہ نہ کرے کہ یہ جسم اور جسمانی قوتیں اسکی اپنی ملک ہیں یا کسی کا عطیّہ ہیں، اِن کا حساب کوئی لینے والا ہے یا نہیں، اور اِن کے استعمال کا ضابطہ اسے خود متعین کرنا ہے یا کسی اور کو؟ اسی طرح کیا وہ اپنے گرد و پیش کی اشیاء کے متعلق کوئی طرزِ عمل اختیار کر سکتا ہے جب تک اس امر کا تعین نہ کرے کہ اِن اشیاء کا مالک وہ خود ہے یا کوئی اور، اِن پر اُسکے اختیارات محدود ہیں یا غیر محدود، اور محدود ہیں تو حدود مقرر کرنے والا کون ہے؟ اسی طرح کیا وہ آپس میں اپنے ابنائے نوع کے ساتھ برتاؤ کی کوئی شکل متعین کر سکتا ہے جب تک اس معاملہ میں کوئی رائے قائم نہ کرے کہ انسانیت کس چیز سے عبارت ہے، انسان اور انسان کے درمیان فرق و امتیاز کی بنیاد کیا ہے، اور دوستی و دشمنی، اتفاق و اختلاف، تعاون اور عدم تعاون کی اساس کن

امور پر ہے؟ اسی طرح کیا وہ بحیثیت مجموعی اس دُنیا کے ساتھ کوئی رویہ اختیار کر سکتا ہے جب تک اس معاملہ میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچے کہ یہ نظامِ کائنات کس قسم کا ہے، اور اس میں میری کیا حیثیت ہے؟

جو مقدمہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اُسکی بنا پر بلا تأمل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام امور کے متعلق ایک رائے قائم کیے بغیر کوئی رویہ اختیار کرنا غیر ممکن ہے۔ فی الواقع ہر انسان جو دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے، اِن سوالات کے متعلق شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر کوئی نہ کوئی رائے ضرور رکھتا ہے اور رکھنے پر مجبور ہے، کیونکہ وہ اس رائے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص نے اِن سوالات پر فلسفیانہ غور و فکر کیا ہو اور واضح طور پر تنقیحات قائم کر کے ایک ایک سوال کا فیصلہ کیا ہو۔ نہیں، بہت سے آدمیوں کے ذہن میں ان سوالات کی سرے سے کوئی متعین صورت ہوتی ہی نہیں۔ نہ وہ کبھی ان پر بالارادہ سوچتے ہیں۔ مگر باوجود اسکے ہر آدمی اجمالی طور پر ان سوالات کے متعلق منفی یا مثبت پہلو میں ایک رائے پر لا محالہ پہنچ جاتا ہے، اور زندگی میں اُس کا جو رویہ بھی ہوتا ہے لازمی طور پر اُسی رائے کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ بات جس طرح اشخاص کے معاملہ میں صحیح ہے اسی طرح جماعتوں کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ چونکہ یہ سوالات انسانی زندگی کے بنیادی سوالات ہیں اس لیے کوئی نظام تمدن و تہذیب اور حیاتِ اجتماعی کے لیے کوئی لائحہ بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ ان سوالات کا کوئی جواب متعین نہ کر لیا جائے۔ اور ان کا جو جواب بھی متعین کیا جائیگا اُسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا، اسی کی نوعیت کے مطابق زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی اور فی الجملہ پورا تمدن ویسا ہی رنگ اختیار کریگا جیسا اُس جواب کا مقتضا ہوگا۔ درحقیقت اس معاملہ میں کوئی تخلف ممکن ہی نہیں ہے۔ خواہ ایک شخص کا رویہ ہو یا ایک سوسائیٹی کا، بہرحال وہ ٹھیک وہی نوعیت اختیار کریگا جو ان سوالات کے جواب کی نوعیت ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر آپ چاہیں تو ایک شخص یا ایک جماعت کے رویہ کا تجزیہ کر کے بآسانی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس رویہ کی تہ میں زندگی کے اِن بنیادی سوالات کا کونسا جواب کام کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ بات قطعی محال ہے

کہ کسی شخصی یا اجتماعی رویّہ کی نوعیت کچھ ہو اور ان سوالات کے جواب کی نوعیت کچھ اور ہو۔ اختلاف زبانی دعوے اور واقعی رویّہ کے درمیان تو ضرور ہو سکتا ہے، لیکن ان سوالات کا جو جواب در حقیقت نفس کے اندر متمکن ہے اُسکی نوعیت اور عملی رویّہ کی نوعیت میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

اچھا اب ہمیں ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہیے۔ زندگی کے یہ بنیادی مسائل جنکے متعلق ابھی آپنے سُنا کہ ان کا کوئی حل اپنے ذہن میں متعین کیے بغیر آدمی دنیا میں ایک قدم نہیں چل سکتا، اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ سب کے سب امور غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا کوئی جواب اُفق پر لکھا ہُوا نہیں ہے کہ ہر انسان دُنیا میں آتے ہی اسکو پڑھ لے۔ اور ان کا کوئی جواب ایسا بدیہی بھی نہیں ہے کہ ہر انسان کو خود بخود معلوم ہو جائے۔ اسی وجہ سے ان کا کوئی ایک حل نہیں ہے جس پر سارے انسان متفق ہوں۔ بلکہ انکے بارے میں ہمیشہ انسانوں کے درمیان اختلاف رہا ہے اور ہمیشہ مختلف انسان مختلف طریقوں سے انکو حل کرتے رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ انکو حل کرنے کی کیا صورتیں ممکن ہیں، کیا صورتیں دُنیا میں اختیار کی گئی ہیں، اور ان مختلف صورتوں سے جو حل نکلتے ہیں وہ کس قسم کے ہیں؟

انکے حل کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے حواس پر اعتماد کرے اور حواس سے جیسا کچھ محسوس ہوتا ہے اُسی کی بنا پر ان امور کے متعلق ایک رائے قائم کرلے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشاہدۂ حسی کے ساتھ وہم و قیاس کو ملا کر ایک نتیجہ اخذ کیا جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ پیغمبرؑ جو حقیقت کا براہِ راست علم رکھنے کا دعویٰ کرتے ہوئے ان مسائل کا جو حل بیان کیا ہے اسکو قبول کر لیا جائے۔

دُنیا میں اب تک اِن مسائل کے حل کی یہی تین صورتیں اختیار کی گئی ہیں، اور غالباً یہی تین صورتیں ممکن بھی ہیں۔ ان میں سے ہر صورت ایک جداگانہ طریقہ سے ان مسائل کو حل کرتی ہے، ہر ایک حل سے ایک خاص قسم کا رویہ وجود میں آتا ہے اور ایک خاص نظام اخلاق اور نظام تمدن بنتا ہے جو

اپنی بنیادی خصوصیات میں دوسرے تمام علوں کے پیدا کردہ رویوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ان مختلف طریقوں سے ان مسائل کے کیا حل نکلتے ہیں اور ہر ایک حل کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے۔

خالص جاہلیت

حواس پر اعتماد کر کے جب انسان اِن مسائل کے متعلق کوئی رائے قائم کرتا ہے تو اس طرزِ فکر کی عین فطرت کے تقاضے سے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامہ وجود و ظہور ہے جس کے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد نہیں۔ یونہی بن گیا ہے۔ یونہی چل رہا ہے۔ اور یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائیگا۔ اس کا کوئی مالک نظر نہیں آتا، لہٰذا وہ یا تو ہے ہی نہیں، یا اگر ہے تو انسان کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو شائد اتفاقاً یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ اس کو کسی نے پیدا کیا یا یہ خود پیدا ہو گیا۔ بہرحال یہ سوال خارج از بحث ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے۔ کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لیے اسکی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے۔ کچھ قویٰ اور کچھ آلات رکھتا ہے جو اِن خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اور اسکے گرد و پیش زمین کے دامن پر بے حد و حساب سامان پھیلا ہوا ہے جس پر یہ اپنے قویٰ اور آلات کو استعمال کر کے اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اسکی قوتوں کا کوئی مصرف اسکے سوا نہیں کہ یہ اپنی خواہشات و ضروریات کو زیادہ سے زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرے۔ اور دنیا کی کوئی حیثیت اسکے سوا نہیں کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جو اس لیے پھیلا ہوا ہے کہ انسان اس پر ہاتھ مارے۔ اوپر کوئی صاحبِ امر نہیں جس کے سامنے انسان جوابدہ ہو۔ اور نہ کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود ہے جہاں سے انسان کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو۔ لہٰذا انسان ایک خود مختار اور غیر ذمہ دار ہستی ہے۔ اپنے لیے ضابطہ و قانون بنانا اور اپنی قوتوں کا مصرف تجویز کرنا، اور موجودات کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کا تعین کرنا اس کا اپنا کام ہے۔

اسکے لیے اگر کوئی ہدایت ہے تو جانوروں کی زندگی میں، پتھروں کی سرگذشت میں، یا خود اپنی تاریخ کی تجربات میں ہے۔ اور یہ اگر کسی کے سامنے جوابدہ ہے تو آپ اپنے سامنے یا اُس اقتدار کے سامنے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائے۔ زندگی جو کچھ ہے یہی دنیوی زندگی ہے اور اعمال کے سارے نتائج اسی زندگی کی حد تک ہیں۔ لہذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر، قابلِ اخذ اور قابلِ ترک ہونے کا فیصلہ صرف اُنہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائیگا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ ایک پورا نظریہ حیات ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا جواب حسی مشاہدہ پر دیا گیا ہے۔ اور اس جواب کا ہر جزو دوسرے جزو کے ساتھ کم از کم ایک منطقی ربط اور ایک مزاجی موافقت ضرور رکھتا ہے جسکی وجہ سے انسان دُنیا میں ایک ہموار و یکساں رویہ اختیار کر سکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ یہ جواب اور اس سے پیدا ہونے والا رویہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ اب اُس رویہ پر ایک نگاہ ڈالیے جو اس جواب کی بنا پر آدمی دُنیا میں اختیار کرتا ہے۔

انفرادی زندگی میں اس نقطۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اوّل سے لے کر آخر تک خود مختارانہ اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار کرے۔ وہ اپنے آپ کو اپنے جسم اور اپنی جسمانی قوتوں کا مالک سمجھیگا، اس لیے اپنے حسبِ منشا جس طرح چاہے گا اُنہیں استعمال کریگا۔ دُنیا کی جو چیزیں اسکے قبضہ قدرت میں آئیں گی اور جن انسانوں پر اسکو اقتدار حاصل ہوگا ان سب کے ساتھ وہ اس طرح برتاؤ کریگا جیسے کہ وہ ان کا مالک ہے۔ اسکے اختیارات کو محدود کرنے والی چیز صرف قوانین قدرت کی حدیں اور اجتماعی زندگی کی ناگزیر بندشیں ہوں گی۔ خود اُسکے اپنے نفس میں کوئی ایسا اخلاقی احساس — ذمہ داری کا احساس اور کسی باز پرس کا خوف — نہ ہوگا جو اسے شترِ بے مہار بننے سے روکتا ہو۔ جہاں خارجی رکاوٹیں نہ ہوں، یا جہاں وہ ان رکاوٹوں کے علی الرغم کام کرنے پر قادر ہو وہاں تو اسکے عقیدہ کا فطری اقتضاء یہ ہے کہ وہ ظالم، بددیانت، شریر اور مفسد ہو۔ وہ فطرتاً خودغرض،

مادہ پرست، اور ابن الوقت ہوگا۔ اسکی زندگی کا کوئی مقصد اپنی نفسانی خواہشات اور حیوانی ضروریات کی خدمت کے سوا نہ ہوگا، اور اسکی نگاہ میں قدر و قیمت صرف اُن چیزوں کی ہوگی جو اُسکے اِس مقصدِ زندگی کے لیے کوئی قیمت رکھتی ہوں۔ افراد میں یہ سیرت و کردار پیدا ہونا اس عقیدے کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔ بے شک یہ ممکن ہے کہ مصلحت اور دور اندیشی کی بنا پر ایسا شخص ہمدرد ہو، ایثار پیشہ ہو، اپنی قوم کی فلاح و ترقی کے لیے جان توڑ کوشش کرتا ہو، اور فی الجملہ اپنی زندگی میں ایک طرح کے ذمہ دارانہ اخلاق کا اظہار کرے۔ لیکن جب آپ اسکے اس رویہ کا تجزیہ کرینگے تو معلوم ہوگا کہ دراصل یہ اسکی خود غرضی و نفسانیت ہی کی توسیع ہے۔ وہ اپنے ملک یا اپنی قوم کی بھلائی میں اپنی بھلائی دیکھتا ہے اس لیے اسکی بھلائی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص زیادہ سے زیادہ بس ایک نیشنلسٹ ہی ہو سکتا ہے۔

پھر جو سوسائیٹی اس ذہنیت کے افراد سے بنے گی اسکی امتیازی خصوصیات یہ ہونگی: سیاست کی بنیاد انسانی حاکمیت پر قائم ہوگی، خواہ وہ ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک طبقہ کی حاکمیت ہو، یا جمہور کی حاکمیت۔ زیادہ سے زیادہ بلند اجتماعی تصور جو قائم کیا جا سکے گا وہ بس دولت مشترکہ (Common wealth) کا تصور ہوگا۔ اس مملکت میں قانون ساز انسان ہونگے۔ تمام قوانین خواہش اور تجربی مصلحت کی بنا پر بنائے اور بدلے جائینگے۔ اور منفعت پرستی و مصلحت پرستی ہی کے لحاظ سے پالیسیاں بھی بنائی اور بدلی جائیں گی۔ مملکت کے حدود میں وہ لوگ زور کر کے اُبھر آئینگے جو سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ چالاک مکار، جھوٹے، دغاباز، سنگدل اور خبیث النفس ہونگے۔ سوسائیٹی کی رہنمائی اور مملکت کی زمامِ کار انہی کے ہاتھ میں ہوگی، اور انکی کتاب آئین میں زور کا نام حق، اور بے زوری کا نام باطل ہوگا۔ تمدن و معاشرت کا سارا نظام نفس پرستی پر قائم ہوگا۔ لذاتِ نفس کی طلب ہر اخلاقی قید سے آزاد ہوتی چلی جائیگی، اور تمام اخلاقی معیار اس طرح قائم کیئے جائینگے کہ انکی وجہ سے لذتوں کے حصول میں کم سے کم

رکاوٹ ہو۔ اسی ذہنیت سے آرٹ اور لٹریچر متاثر ہونگے اور انکے اندر عریانی وشہوانیت کے عناصر بڑھتے چلے جائینگے۔ معاشی زندگی میں کبھی جاگیرداری سسٹم برسرعروج آئیگا، کبھی سرمایہ داری نظام اسکی جگہ لیگا اور کبھی مزدور شورش کرکے اپنی ڈکٹیٹرشپ قائم کریں گے۔ عدل سے بہرحال معیشت کا رشتہ کبھی قائم نہ ہوسکیگا، کیونکہ دنیا اور اسکی دولت کے بارے میں اس سوسائیٹی کے ہر فرد کا بنیادی رویہ اس تصور پر مبنی ہوگا کہ یہ ایک خوان یغما ہے جس پر حسب منشاء اور حسب موقع ہاتھ مارنے کے لیے وہ آزاد ہے۔

پھر اس سوسائیٹی میں افراد کو تیار کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کا جو نظام قائم ہوگا اُسکا مزاج بھی اسی تصورِ حیات اور اسی رویہ کے مناسب حال ہوگا۔ اُس میں ہر نئی آنے والی نسل کو دنیا اور انسان، اور دنیا میں انسان کی حیثیت کے متعلق وہی تصور دیا جائیگا جسکی تشریح میں نے اوپر کی ہے۔ تمام معلومات، خواہ وہ کسی شعبۂ علم سے متعلق ہوں، اُن کو ایسی ہی ترتیب کے ساتھ دی جائینگی کہ آپ سے آپ اُنکے ذہن میں زندگی کا یہ تصور پیدا ہو جائے۔ اور پھر ساری تربیت اس ڈھنگ کی ہوگی کہ وہ زندگی میں یہی رویہ اختیار کرنے اور اسی طرز کی سوسائیٹی میں کھپ جانے کے لیے تیار ہوں۔ اس تعلیم و تربیت کی خصوصیات کے متعلق مجھے آپ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ آپ لوگوں کو اسکا ذاتی تجربہ ہے۔ جن درسگاہوں میں آپ تربیت پارہے ہیں وہ سب اسی نظریہ پر قائم ہوئی ہیں اگرچہ اُنکے نام اسلامیہ کالج اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ ہیں۔

یہ رویہ جسکی تشریح میں نے ابھی آپکے سامنے کی، خالص جاہلیت کا رویہ ہے۔ اسکی نوعیت وہی ہے جو اُس بچے کے رویے کی نوعیت ہے جو محض حسی مشاہدے پر اعتماد کرکے آگ کو ایک خوبصورت کھلونا سمجھتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اس مشاہدے کی غلطی فوراً تجربے سے ظاہر ہو جاتی ہے، کیونکہ جس آگ کو کھلونا سمجھ کر وہ دست اندازی کا رویہ اختیار کرتا ہے وہ گرم آگ ہوتی ہے، ہاتھ لگاتے ہی فوراً بتا دیتی ہے کہ میں کھلونا نہیں ہوں۔ بخلاف اس کے یہاں مشاہدے کی غلطی بڑی دیر میں کھلتی ہے، بلکہ بہتوں پر کھلتی ہی نہیں، کیونکہ جس آگ پر یہ ہاتھ ڈالتے ہیں اُسکی آنچ دھیمی ہے، فوراً چرکا نہیں دیتی

بلکہ صدیوں تک تپاتی رہتی ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص تجربات سے سبق لینے کے لیے تیار ہو تو شب و روز کی زندگی میں اس نظریہ کی بدولت افراد کی بے ایمانیوں، حکام کے مظالم، منصفوں کی بے انصافیوں، مالداروں کی خودغرضیوں، اور عام لوگوں کی بداخلاقیوں کا جو تلخ تجربہ اسکو ہوتا ہے، اور بڑے پیمانے پر اسی نظریہ سے قوم پرستی، امپیریلزم، جنگ، فساد، ملک گیری اور اقوام کُشی کے جو شرارے نکلتے ہیں، اُنکے چرکوں سے وہ یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ رویہ جاہلیت کا رویہ ہے علمی رویہ نہیں ہے۔ کیونکہ انسان نے اپنے متعلق اور نظام کائنات کے متعلق جو رائے قائم کرکے یہ رویہ اختیار کیا ہے وہ امر واقعی کے مطابق نہیں ہے ورنہ اس سے یہ بُرے نتائج ظاہر نہ ہوتے۔

اب ہمیں دوسرے طریقہ کا جائزہ لینا چاہیے۔ زندگی کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مشاہدے کے ساتھ قیاس و وہم سے کام لیکر ان مسائل کے متعلق کوئی رائے قائم کی جائے۔ اس طریقے سے تین مختلف رائیں قائم کی گئی ہیں اور ہر ایک رائے سے ایک خاص قسم کا رویہ پیدا ہوا ہے:

شرک

۱۔ ایک رائے یہ ہے کہ کائنات کا یہ نظام بے خداوند تو نہیں ہے، مگر اسکا ایک خداوند (الٰہ یا رب) نہیں، بلکہ بہت سے خداوند (آلہہ اور ارباب) ہیں۔ کائنات کی مختلف قوتوں کا سررشتہ مختلف خداؤں کے ہاتھ میں ہے اور انسان کی سعادت و شقاوت، کامیابی و ناکامی، نفع و نقصان بہت سی ہستیوں کی مہربانی و نامہربانی پر منحصر ہے۔ یہ رائے جن لوگوں نے اختیار کی ہے اُنہوں نے پھر اپنے وہم و قیاس سے کام لیکر یہ تعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدائی کی طاقتیں کہاں کہاں اور کس کس کے ہاتھ میں ہیں۔ اور جن جن چیزوں پر بھی اُنکی نگاہ جاکر ٹھیری ہے اُنہی کو خدا مان لیا ہے۔

اس رائے کی بنا پر جو طرزِ عمل انسان اختیار کرتا ہے اسکی امتیازی خصوصیات یہ ہیں:

اولاً، اس سے آدمی کی پوری زندگی اوہام کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ وہ کسی علمی ثبوت کے

بغیر مجرد اپنے وہم و خیال سے بہت سی چیزوں کے متعلق یہ رائے قائم کرتا ہے کہ وہ فوق الفطری طریقوں سے اسکی قسمت پر اچھا یا بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ اس لیے وہ اچھے اثرات کی موہوم امید اور بُرے اثرات کے موہوم خوف میں مبتلا ہو کر اپنی بہت سی قوتیں لاحاصل طریقہ سے ضائع کر دیتا ہے۔ کہیں کسی قبر سے اُمید لگاتا ہے کہ یہ میرا کام کر دے گی۔ کہیں کسی بُت پر بھروسہ کرتا ہے کہ وہ میری قسمت بنا دے گا۔ کہیں کسی اور خیالی کارساز کو خوش کرنے کے لیے دوڑتا پھرتا ہے۔ کہیں کسی بُرے شگون سے دل شکستہ ہو جاتا ہے۔ اور کہیں کسی اچھے شگون سے توقعات کے خیالی قلعے بنا لیتا ہے۔ یہ ساری چیزیں اسکے خیالات اور اسکی کوششوں کو فطری تدابیر کے راستہ سے ہٹا کر ایک بالکل غیر فطری راستہ پر ڈال دیتی ہیں۔

ثانیاً، اس رائے کی وجہ سے پوجا پاٹ، نذر نیاز، اور دوسری رسموں کا ایک لمبا چوڑا دستور العمل بنتا ہے جس میں الجھ کر آدمی کی سعی و عمل کا ایک بڑا حصہ بے نتیجہ مشغولیتوں میں صرف ہو جاتا ہے۔

ثالثاً، جو لوگ اس مشرکانہ وہم پرستی میں مبتلا ہوتے ہیں اُنکو بے وقوف بنا کر اپنے جال میں پھانس لینے کا چالاک آدمیوں کو خوب موقع مل جاتا ہے۔ کوئی بادشاہ بن کر بیٹھتا ہے اور سورج، چاند، یا دوسرے دیوتاؤں سے اپنا نسب ملا کر لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہم بھی خداؤں میں سے ہیں اور تم ہمارے بندے ہو۔ کوئی پروہت یا مجاور بن بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارا نفع و نقصان جن سے وابستہ ہے ان سے ہمارا تعلق ہے اور تم ہمارے ہی واسطے سے ان تک پہنچ سکتے ہو۔ کوئی پنڈت اور پیر بن جاتا ہے اور تعویذ گنڈوں اور منتروں اور عملیات کا ڈھونگ رچا کر لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہماری یہ چیزیں فوق الفطری طریقے سے تمہاری حاجتیں پوری کرینگی۔ پھر ان سب چالاک لوگوں کی نسلیں مستقل خاندانوں اور طبقوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جنکے حقوق، امتیازات، اور اثرات امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور گہری بنیادوں پر جمتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اس عقیدہ کی بدولت عام انسانوں کی گردنوں پر شاہی خاندانوں، مذہبی عہدہ داروں، اور روحانی پیشواؤں کی خدائی کا جُوا مسلّط ہوتا ہے اور یہ بناوٹی خدا اُنکو اس طرح اپنا خادم بناتے ہیں کہ گویا وہ اِنکے لیے دودھ دینے

اور سواری اور بار برداری کے جانور ہیں۔

سرابعاً، یہ نظریہ نہ تو علوم و فنون، فلسفہ و ادب، اور تمدن و سیاست کے لیے کوئی مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اور نہ اُن خیالی خداؤں سے انسانوں کو کسی قسم کی ہدایت ہی ملتی ہے کہ وہ اُسکی پابندی کریں۔ ان خداؤں سے تو انسان کا تعلق صرف اس حد تک محدود رہتا ہے کہ یہ اُنکی مہربانی و اعانت حاصل کرنے کے لیے بس عبودیت کے چند مراسم ادا کردے۔ باقی رہے زندگی کے معاملات تو انکے متعلق قوانین اور ضوابط بنانا اور عمل کے طریقے معین کرنا انسان کا اپنا کام ہوتا ہے۔ اس طرح مشرک سوسائیٹی عملاً اُنہی سب راہوں پر چلتی ہے جنکا ذکر خالص جاہلیت کے سلسلہ میں ابھی مَیں آپ سے کرچکا ہوں۔ وہی اخلاق، وہی اعمال، وہی طرزِ تمدن، وہی سیاست، وہی نظامِ معیشت، اور وہی علم و ادب۔ اِن تمام حیثیتوں سے شرک کے رویّے اور خالص جاہلیت کے رویّہ میں کوئی اصولی فرق نہیں ہوتا۔

رھبانیت

۲۔ دوسری رائے جو مشاہدے کے ساتھ قیاس و وہم کو ملا کر قائم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دُنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لیے ایک دارالعذاب ہے۔ انسان کی روح ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت سے اس قفس میں بند کی گئی ہے۔ لذّات و خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں اصل میں یہ اس قیدخانہ کے طوق و سلاسل ہیں۔ انسان جتنا اس دنیا اور اسکی چیزوں سے تعلق رکھے گا اتنا ہی ان زنجیروں میں پھنستا چلا جائیگا اور مزید عذاب کا مستحق ہوگا۔ نجات کی صورت اِس کے سوا کوئی نہیں کہ زندگی کے سارے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جائے۔ خواہشات کو مٹایا جائے۔ لذات سے کنارہ کشی کی جائے۔ جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبوں کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے۔ اُن تمام محبتوں کو دل سے نکال دیا جائے جو گوشت و خون کے تعلق سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اپنے اس دشمن یعنی نفس و جسم کو مجاہدوں اور ریاضتوں سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اُس کا تسلط قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح روح

ہلکی اور پاک صاف ہو جائیگی اور نجات کے بلند مقام پر اُڑنے کی طاقت حاصل کرلے گی۔

اس رائے سے جو رویّہ پیدا ہوتا ہے اسکی خصوصیات یہ ہیں:۔

اوّلاً، اس سے انسان کے تمام رجحانات اجتماعیت سے انفرادیت کی طرف اور تمدن سے وحشت کی طرف پھر جاتے ہیں۔ وہ دُنیا اور اُس کی زندگی سے مُنہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ذمہ داریوں سے بھاگتا ہے۔ اسکی ساری زندگی عدم تعاون اور ترک موالات کی زندگی بن جاتی ہے۔ اور اسکے اخلاق زیادہ تر سلبی (Negative) نوعیت کے ہو جاتے ہیں۔

ثانیاً، اس رائے کی بدولت نیک لوگ دُنیا کے کاروبار سے ہٹ کر اپنی نجات کی فکر میں گوشہ ہائے عزلت کی طرف چلے جاتے ہیں اور دُنیا کے سارے معاملات شریر لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتے ہیں۔

ثالثاً، تمدن میں اس رائے کا اثر جس حد تک پہنچتا ہے اس سے لوگوں کے اندر سلبی اخلاقیات، غیر تمدنی (Anti-social) اور انفرادیت پسندانہ (Individualistic) رجحانات اور مایوسانہ خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ انکی عملی قوتیں سرد ہو جاتی ہیں۔ وہ ظالموں کے لیے نرم نوالہ بن جاتے ہیں اور ہر جابر حکومت انکو آسانی سے قابو میں لاسکتی ہے۔ درحقیقت یہ نظریہ عوام کو ظالموں کے لیے ذلول (Tame) بنانے میں جادو کی تاثیر رکھتا ہے۔

رابعاً، انسانی فطرت سے اس راہبانہ نظریہ کی مستقل جنگ رہتی ہے اور اکثر یہ اُس سے شکست کھاتا ہے۔ پھر جب یہ شکست کھاتا ہے تو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے اسے حیلوں کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے کہیں کفارہ کا عقیدہ ایجاد ہوتا ہے۔ کہیں عشق مجازی کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے اور کہیں ترکِ دُنیا کے پردے میں وہ دنیا پرستی کی جاتی ہے جسکے آگے دنیا پرست بھی شرما جائیں۔

ہمہ اوست

۳۔ تیسری رائے جو مشاہدے اور قیاس کی آمیزش سے پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ انسان اور کائنات

اور کائنات کی تمام چیزیں بجائے خود غیر حقیقی ہیں۔ ان کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ دراصل ایک وجود نے ان ساری چیزوں کو خود اپنے ظہور کا واسطہ بنایا ہے اور وہی ان سب کے اندر کام کر رہا ہے تفصیلات میں اس نظریہ کی بے شمار صورتیں ہیں۔ مگر ان ساری تفصیلات کے اندر قدر مشترک یہی ایک خیال ہے کہ تمام موجودات ایک ہی وجود کا ظہور خارجی ہیں اور دراصل موجود وہی ہے باقی کچھ نہیں۔

اس نظریہ کی بنا پر جو رویہ انسان اختیار کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے خود اپنے ہونے ہی میں شک ہو جاتا ہے کجا کہ وہ کوئی کام کرے۔ وہ اپنے آپکو ایک ایسی کٹھ پتلی سمجھتا ہے جسے کوئی اور نچا رہا ہے یا جسکے اندر کوئی اور ناچ رہا ہے۔ وہ اپنے تخیلات کے نشے میں گم ہو جاتا ہے۔ اسکے لیے نہ کوئی مقصد زندگی ہوتا ہے اور نہ کوئی راہ عمل۔ وہ خیال کرتا ہے کہ میں خود تو کچھ ہوں ہی نہیں، نہ میرے کرنے کا کوئی کام ہے، نہ میرے کیے سے کچھ ہو سکتا ہے۔ اصل میں تو وہ وجود کلی جو مجھ میں اور تمام کائنات میں سرایت کیے ہوئے ہے اور جو ازل سے ابد تک چلا جا رہا ہے، سارے کام اسی کے ہیں اور وہی سب کچھ کرتا ہے۔ وہ اگر مکمل ہے تو میں بھی مکمل ہوں، پھر کوشش کس چیز کے لیے؟ اور وہ اگر اپنی تکمیل کے لیے کوشاں ہے تو جس عالمگیر حرکت کے ساتھ وہ کمال کی طرف جا رہا ہے اسی لپیٹ میں ایک جزء کی حیثیت سے میں بھی آپ سے آپ چلا جاؤنگا۔ میں ایک جزء ہوں، مجھے کیا خبر کہ کل کدھر جا رہا ہے اور کدھر جانا چاہتا ہے؟

اس طرز خیال کے عملی نتائج قریب قریب وہی ہیں جو ابھی میں نے راہبانہ نظریہ کے سلسلہ میں بیان کیے ہیں۔ بلکہ بعض حالات میں اس رائے کو اختیار کرنے والے کا طرز عمل اُن لوگوں کے رویہ سے ملتا جلتا ہوتا ہے جو خالص جاہلیت کا نظریہ اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اپنی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے اور پھر جدہر خواہشات لے جاتی ہیں اس طرف یہ سمجھتے ہوئے بے تکلف چلا جاتا ہے کہ جانے والا وجود کلی ہے نہ کہ میں۔

پہلے نظریہ کی طرح یہ تینوں نظریے بھی جاہلیت کے نظریے ہیں۔ اور اس بنا پر جو رویے ان سے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی جاہلیت ہی کے رویے ہیں۔ اس لیے کہ اول تو ان میں سے کوئی نظریہ بھی کسی علمی ثبوت پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیالی اور قیاسی بنیادوں پر مختلف رائیں قائم کرلی گئی ہیں۔ دوسرے انکا واقعہ کے خلاف ہونا تجربہ سے ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی رائے بھی امر واقعی کے مطابق ہوتی تو اس کے مطابق عمل کرنے سے برے نتائج تجربے میں نہ آتے۔ جب آپ دیکھتے ہیں کہ ایک چیز کو جہاں کہیں انسان نے کھایا اُسکے پیٹ میں درد ضرور ہوا، تو اس تجربے سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فی الواقع معدہ کی جو ساخت ہے اور جو اُسکی طبیعت ہے، یہ چیز اس کے مطابق نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جب یہ حقیقت ہے کہ شرک، رہبانیت اور وجودیت کے نظریے اختیار کرنے سے انسان کو بحیثیت مجموعی نقصان ہی پہنچا تو یہ بھی اس امر کا ثبوت ہے، کہ ان میں سے کوئی نظریہ بھی واقعہ اور حقیقت کے مطابق نہیں ہے۔

اسلام

اب ہمیں تیسری صورت کو لینا چاہیے جو زندگی کے ان بنیادی مسائل کے متعلق رائے قائم کرنے کی آخری صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ پیغمبروں نے ان مسائل کا جو حل پیش کیا ہے اُسے قبول کیا جائے۔

اس طریقہ کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی اجنبی مقام پر آپ ہوں اور آپکو خود اُس مقام کے متعلق کوئی واقفیت نہ ہو تو آپ کسی دُوسرے شخص سے دریافت کریں اور اُسکی راہ نمائی میں وہاں کی سیر کریں۔ ایسی صورتِ حال جب پیش آتی ہے تو آپ پہلے اُس شخص کو تلاش کرتے ہیں جو خود واقف کار ہونیکا دعویٰ کرے، پھر آپ قرائن سے اس امر کا اطمینان کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ شخص قابلِ اعتماد ہے یا نہیں، پھر آپ اس کی راہ نمائی میں چل کر دیکھتے ہیں، اور جب تجربہ سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اسکی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جو عمل آپ نے کیا اس سے کوئی برا نتیجہ نہیں نکلا تو آپکو پوری طرح اطمینان ہوجاتا ہے کہ واقعی وہ شخص واقف کار تھا اور اس جگہ کے متعلق جو معلومات اُس نے دی تھیں وہ صحیح تھیں۔

یہ ایک علمی طریقہ ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا طریق علمی ممکن نہ ہو تو پھر رائے قائم کرنے کے لیے یہی ایک صحیح طریقہ ہو سکتا ہے۔

اب دیکھیے دُنیا آپ کے لیے ایک اجنبی جگہ ہے۔ آپکو نہیں معلوم کہ اسکی حقیقت کیا ہے، اس کا انتظام کس قسم کا ہے، کس آئین پر یہ کارخانہ چل رہا ہے، اسکے اندر آپکی کیا حیثیت ہے، اور یہاں آپکے لیے کیا رویہ مناسب ہے۔ آپ نے پہلے یہ رائے قائم کی کہ جیسا بظاہر نظر آتا ہے اصل حقیقت بھی وہی ہے۔ آپ نے اس رائے پر عمل کیا مگر نتیجہ غلط نکلا۔ پھر آپ نے قیاس اور گمان کی بنا پر مختلف رائیں قائم کیں اور ہر ایک پر عمل کر کے دیکھا مگر ہر صورت میں نتیجہ غلط ہی رہا۔ اس کے بعد آخری صورت یہی ہے کہ آپ پیغمبروں کی طرف رجوع کریں۔ یہ لوگ واقف کار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انکے حالات کی جتنی چھان بین کی جاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سچّے، نہایت امین، نہایت نیک، نہایت بے غرض، اور نہایت صحیح الدماغ لوگ ہیں۔ لہٰذا بادی النظر میں اُن پر اعتماد کرنے کے لیے کافی وجہ موجود ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ دنیا کے متعلق اور دنیا میں آپکی حیثیت کے متعلق جو معلومات وہ دیتے ہیں وہ کہاں تک لگتی ہوئی ہیں، ان کے خلاف کوئی علمی ثبوت تو نہیں ہے، اور انکے مطابق جو رویہ دنیا میں اختیار کیا گیا وہ تجربہ سے کیسا ثابت ہوا۔ اگر تحقیق سے ان تینوں باتوں کا جواب بھی اطمینان بخش نکلے تو ان کی راہنمائی پر ایمان لے آنا چاہیے اور زندگی میں وہی رویہ اختیار کرنا چاہیے جو اس نظریہ کے مطابق ہو۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا پچھلے جاہلیت کے طریقوں کے مقابلہ میں یہ طریقہ علمی طریقہ ہے۔ اور اگر اس علم کے آگے آدمی سر تسلیم خم کر دے، اگر خودسری اور خود رائی چھوڑ کر اس علم کا اتباع کرے، اور اپنے رویہ کو انہی حدود کا پابند بنا دے جو اس علم نے قائم کی ہیں تو اسی طریقہ کا نام اسلامی طریقہ ہے۔

انبیاء کا نظریۂ کائنات و انسان

پیغمبر کہتے ہیں:

یہ سارا عالم ہست و بود جو انسان کے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جز انسان بھی ہے کوئی اتفاقی ہنگامہ نہیں ہے بلکہ ایک منظم، باضابطہ سلطنت ہے۔ اللہ نے اسکو بنایا ہے وہی اس کا مالک ہے۔ اور وہی اس کا اکیلا حاکم ہے۔ یہ ایک کلی نظام (Totalitarian System) ہے جس میں تمام اختیارات مرکزی اقتدار کے ہاتھ میں ہیں۔ اُس مقتدر اعلیٰ کے سوا یہاں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ تمام قوتیں جو نظام عالم میں کام کر رہی ہیں، اُسی کے زیر حکم ہیں اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے، یا اس کے اذن کے بغیر اپنے اختیار سے کوئی حرکت کرے۔ اس ہمہ گیر سسٹم کے اندر کسی کی خود مختاری (Independence) اور غیر ذمہ داری (Irresponsibility) کے لیے کوئی جگہ نہیں، نہ فطرۃً ہو سکتی ہے۔

انسان یہاں پیدائشی رعیت (Born subject) ہے، رعیت ہونا یا نہ ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا کچھ اور ہونا اسکے امکان میں نہیں ہے، لہٰذا یہ خود اپنے لیے طریق زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

یہ کسی چیز کا مالک نہیں ہے کہ اپنی ملک میں تصرف کرنے کا ضابطہ خود بنائے۔ اِس کا جسم اور اِس کی ساری قوتیں اللہ کی ملک اور اُس کا عطیہ ہیں، لہٰذا یہ اُن کو خود اپنے منشاء کے مطابق استعمال کرنے کا حق دار نہیں ہے، بلکہ جس نے یہ چیزیں اسکو عطا کی ہیں اُسی کی مرضی کے مطابق اسے اُنکو استعمال کرنا چاہیے۔

اسی طرح جو اشیاء اِس کے گرد و پیش دنیا میں پائی جاتی ہیں، زمین، جانور، پانی، نباتات، معدنیات وغیرہ، یہ سب اللہ کی ملک ہیں، انسان اُنکا مالک نہیں ہے، لہٰذا انسان کو ان پر بھی اپنی مرضی سے مطابق تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ اسے انکے ساتھ اُس قانون کے مطابق برتاؤ کرنا چاہیے جو اصل مالک نے مقرر کیا ہے۔

اسی طرح وہ تمام انسان بھی جو زمین پر بستے ہیں، اور جنکی زندگی ایک دوسرے سے وابستہ ہے

اللہ کی رعیت ہیں۔ لہٰذا انکو اپنے باہمی تعلقات کے بارے میں خود اصول اور ضابطے مقرر کرنیکا حق نہیں ہے۔ اُنکے جملہ تعلقات خدا کے بنائے ہوئے قانون پر مبنی ہونے چاہئیں۔

رہی یہ بات کہ وہ خدا کا قانون کیا ہے؟ تو پیغمبر یہ کہتے ہیں کہ جس ذریعۂ علم کی بنا پر ہم تمہیں دُنیا کی اور خود تمہاری یہ حقیقت بتا رہے ہیں، اُسی ذریعۂ علم سے ہم کو خدا کا قانون بھی معلوم ہُوا ہے۔ خدا نے خود ہم کو یہ علم دیا ہے اور ہمکو اس بات پر مامور کیا ہے کہ یہ علم تم تک پہنچا دیں۔ لہٰذا تم ہم پر اعتماد کرو۔ ہمیں اپنے بادشاہ کا نمائندہ تسلیم کرو۔ اور ہم سے اس کا مستند قانون لو۔

پھر پیغمبر ہم سے کہتے ہیں کہ یہ جو تم بظاہر دیکھتے ہو کہ سلطنتِ عالم کا سارا کا روبار ایک نظم کے ساتھ چل رہا ہے مگر نہ خود سلطان نظر آتا ہے نہ اُسکے کارپرداز کام کرتے دکھائی دیتے ہیں، اور یہ جو تم ایک طرح کی خود مختاری اپنے اندر محسوس کرتے ہو کہ جس طرح چاہو کام کرو، مالکانہ روش بھی اختیار کر سکتے ہو، اور اصل مالک کے سوا دوسروں کے سامنے بھی اطاعت و بندگی میں سر جھکا سکتے ہو، ہر صورت میں تم کو رزق ملتا ہے، وسائل کار بہم پہنچتے ہیں، اور بغاوت کی سزا فوراً نہیں دی جاتی، یہ سب دراصل تمہاری آزمائش کے لیے ہے۔ چونکہ تم کو عقل، قوتِ مشاہدہ، قوتِ استنباط، اور قوتِ انتخاب دی گئی ہے، اِس لیے مالک نے اپنے آپکو اور اپنے نظامِ سلطنت کو تمہاری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ وہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے کہ تم اپنی اِن قوتوں سے کس طرح کام لیتے ہو۔ اس نے تم کو انتخاب کی آزادی (Freedom of choice) دی ہے اور سمجھ بوجھ عطا کی ہے۔ اگر تم اپنی رعیت ہونے کی حیثیت کو سمجھو، اور برضا و رغبت اس حیثیت کو اختیار کرو، بغیر اسکے کہ تم پر اس حیثیت میں رہنے کے لیے کوئی جبر ہو، تو اپنے مالک کی آزمائش میں کامیاب ہو گے۔ اور اگر رعیت ہونے کی حیثیت کو نہ سمجھا یا سمجھنے کے باوجود باغیانہ روش اختیار کر و تو امتحان میں ناکام ہو جاؤ گے۔ اسی امتحان کی غرض سے تم کو دنیا میں کچھ اختیارات دیے گئے ہیں، دنیا کی بہت سی چیزیں تمہارے قبضہ قدرت میں دی

گئی ہیں، اور تم کو عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے۔

اسکے بعد پیغمبر ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ دنیوی زندگی چونکہ امتحان کی مہلت ہے لہٰذا یہاں نہ حساب ہے، نہ جزا، نہ سزا[1]۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عمل نیک کا انعام نہیں ہے۔ وہ اس بات کی علامت نہیں ہے کہ اللہ تم سے خوش ہے یا جو کچھ تم کر رہے ہو وہ درست ہے۔ بلکہ دراصل وہ محض امتحان کا سامان ہے۔ مال، دولت، اولاد، خدام، حکومت، اسباب زندگی، یہ سب چیزیں ہیں جو تم کو امتحان کی غرض سے دی جاتی ہیں تاکہ تم ان پر کام کر کے دکھاؤ اور اپنی اچھی یا بری قابلیتوں کا اظہار کرو۔ اسی طرح جو تکلیفیں، نقصانات، مصائب وغیرہ آتے ہیں وہ بھی کسی عمل بد کی سزا نہیں ہیں

---

[1] اس سلسلہ میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ عالم جس میں ہم اس وقت ہیں دراصل عالم طبیعی ہے نہ کہ عالم اخلاقی۔ جن قوانین پر کائنات کا موجودہ نظام چل رہا ہے وہ اخلاقی قوانین نہیں ہیں بلکہ طبیعی قوانین ہیں۔ اسلیے موجودہ نظام کائنات میں اعمال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مترتب نہیں ہو سکتے۔ وہ اگر مترتب ہو سکتے ہیں تو صرف اُسی حد تک جس حد تک کہ قوانین طبیعی ان کو مترتب ہونے کا موقع دیں، ورنہ جہاں قوانین طبیعی ان کے ظہور کے لیے سازگار نہ ہوں وہاں ان کا ظاہر ہونا محال ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اس فعل کے اخلاقی نتیجہ کا مترتب ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ قوانین طبیعی اُس کا سراغ لگنے اور اسکے اوپر جرم ثابت ہونے اور اس پر اخلاقی سزا کے نافذ ہونے میں مددگار رہیں۔ اگر وہ مددگار نہ ہوں تو کوئی اخلاقی نتیجہ سرے سے مترتب ہوگا ہی نہیں۔ اور اگر وہ سازگاری کر بھی دیں، تب بھی اس فعل کے پورے اخلاقی نتائج مترتب نہ ہو سکیں گے، کیونکہ مقتول کے عوض قاتل کا محض قتل کر دیا جانا اُس فعل کا پورا اخلاقی نتیجہ نہیں ہے جس کا اس نے ارتکاب کیا تھا۔ اسی لیے یہ دنیا دار الجزاء نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی۔ دار الجزاء ہونے کے لیے ایک ایسا نظام عالم درکار ہے جس میں موجودہ نظام عالم کے برعکس حکمراں قوانین قوانینِ اخلاقی ہوں اور قوانین طبیعی محض انکے خادم کی حیثیت رکھتے ہوں۔

بلکہ ان میں سے بعض قانونِ فطرت کے تحت آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں[۱]، اور بعض آزمائش کے ذیل میں آتے ہیں[۲]، اور بعض اس وجہ سے پیش آتے ہیں کہ حقیقت کے خلاف رائے قائم کرکے جب تم ایک رویہ اختیار کرتے ہو تو لامحالہ تم کو چوٹ لگتی ہے[۳]۔ بہرحال یہ دُنیا دارالجزاء نہیں ہے بلکہ دارالامتحان ہے۔ یہاں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد، قابلِ اخذ، یا قابلِ ترک ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں۔ مہلت کی زندگی ختم ہونے کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں تمہارے پورے کارنامے کو جانچ کر فیصلہ کیا جائیگا کہ تم امتحان میں کامیاب ہوئے ہو یا ناکام۔ اور وہاں جس چیز پر کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے وہ یہ ہے کہ اولاً تم نے اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکمِ حقیقی ہونے اور اسکی طرف سے آئی ہوئی تعلیم و ہدایت کے من جانب اللہ ہونے کو پہچانا یا نہیں، اور ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد آزادیِ انتخاب رکھنے کے باوجود تم نے اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے حکمِ شرعی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا یا نہیں۔

---

[۱] مثلاً زنا کرنے والے کا بیماری میں مبتلا ہونا، کہ یہ اس گناہ کی اخلاقی سزا نہیں ہے بلکہ اس کا طبیعی نتیجہ ہے۔ اگر وہ علاج کرنے میں کامیاب ہو جائے تو بیماری سے بچ جائیگا مگر اخلاقی سزا سے نہ بچے گا۔ اگر توبہ کرے تو اخلاقی سزا سے بچ جائیگا مگر بیماری دور نہ ہوگی۔

[۲] مثلاً کسی شخص کا افلاس میں مبتلا ہونا اسکے حق میں اس امر کی آزمائش ہے کہ وہ اپنی حاجات پوری کرنے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے یا جائز وسائل ہی سے کام لینے پر ثابت قدم رہتا ہے، اور مصائب کے ہجوم میں حق پرستی پر قائم رہتا ہے یا مضطرب ہوکر باطل کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔

[۳] مثلاً جب انسان اس دنیا کو بے خدا اور اپنے آپکو خود مختار سمجھ کر کام کرتا ہے تو چونکہ فی الواقع نہ دنیا بے خدا ہے اور نہ انسان خود مختار، اسلیے امرِ واقعی کے خلاف عمل کرنیکی وجہ سے وہ لامحالہ چوٹ کھاتا ہے۔ اسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے آگ کو کھلونا سمجھ کر آپ ہاتھ میں پکڑ لیں تو ہاتھ جل جائیگا کیونکہ آپ نے امرِ واقعی کے خلاف رویہ اختیار کیا۔

نظریۂ اسلامی کی تنقید

دنیا اور انسان کے متعلق یہ نظریہ جو پیغمبروں نے پیش کیا ہے ایک مکمل نظریہ ہے۔ اسکے تمام اجزاء میں ایک منطقی ربط ہے۔ کوئی جزو دوسرے جزو سے متناقض نہیں ہے۔ اس سے تمام واقعات عالم کی پوری توجیہ اور تمام آثار کائنات کی پوری تعبیر ملتی ہے۔ کوئی ایک چیز بھی مشاہدہ یا تجربہ میں ایسی نہیں آتی جس کی توجیہ اس نظریہ سے نہ کی جاسکتی ہو۔ لہٰذا یہ علمی نظریہ (Scientific theory) کی تعریف میں آتا ہے۔

پھر کوئی مشاہدہ یا تجربہ آج تک ایسا نہیں ہوا جس سے یہ نظریہ ٹوٹ جاتا ہو۔ لہٰذا یہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ٹوٹے ہوئے نظریات میں اسکو شمار نہیں کیا جاسکتا۔

پھر نظام عالم کا جو مشاہدہ ہم کرتے ہیں اُس سے یہ نظریہ نہایت اغلب (Most probable) نظر آتا ہے۔ کائنات میں جو زبردست تنظیم پائی جاتی ہے اُسکو دیکھ کر یہ کہنا زیادہ قرین دانش ہے کہ اس کا کوئی ناظم ہے، بہ نسبت اسکے کہ کوئی ناظم نہیں ہے۔ اسی طرح اس تنظیم کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا زیادہ معقول ہے کہ یہ مرکزی نظام ہے اور ایک ہی مختار کُل اس کا ناظم ہے، بہ نسبت اسکے کہ یہ لامرکزی نظام ہے اور بہت سے ناظموں کے ماتحت چل رہا ہے۔ اسی طرح جو حکمت کی شان اس کائنات کے نظام میں علانیہ محسوس ہوتی ہے اُسے دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا زیادہ قریب از عقل ہے کہ یہ حکیمانہ اور بامقصد نظام ہے، بہ نسبت اسکے کہ بے مقصد ہے اور محض ایک بچے کا کھیل ہے۔

پھر جب ہم اس حیثیت سے غور کرتے ہیں کہ اگر واقعی یہ نظام کائنات ایک سلطنت ہے اور انسان اس نظام کا ایک جزء ہے تو یہ بات ہم کو سراسر معقول معلوم ہوتی ہے کہ اس نظام میں انسان کی خود مختاری و غیر ذمہ داری کے لیے کوئی جگہ نہ ہونی چاہیے اور اس کا صحیح مقام رعیت ہی کا ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے یہ ہم کو نہایت معقول (Most reasonable) نظریہ معلوم ہوتا ہے۔

پھر جب عملی نقطۂ نظر سے ہم دیکھتے ہیں تو یہ بالکل ایک قابل عمل (Practicable) نظریہ

ہے۔ زندگی کی ایک پوری اسکیم اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس نظریہ پر مبنی ہے۔ فلسفہ اور اخلاق کے لیے، علوم و فنون کے لیے، ادب اور ہنر کے لیے، تمدن و معاشرت کے لیے، معیشت اور کاروبار کے لیے، سیاست اور انتظام مملکت کے لیے، صلح و جنگ اور بین الاقوامی تعلقات کے لیے، غرض زندگی کے ہر پہلو اور ہر ضرورت کے لیے یہ ایک مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے اور کسی شعبۂ زندگی میں بھی انسان کو اپنا رویہ متعین کرنے کے لیے اس نظریہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

اب ہمیں صرف یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ اس نظریہ سے دنیا کی زندگی میں کس قسم کا رویہ بنتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں۔

انفرادی زندگی میں یہ نظریہ دوسرے جاہلی نظریات کے برعکس ایک نہایت ذمہ دارانہ اور نہایت منضبط (Well-disciplined) رویہ پیدا کرتا ہے۔ اس نظریہ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے جسم اور اسکی طاقتوں کو اور دنیا اور اسکی کسی چیز کو بھی اپنی ملک سمجھ کر خود مختارانہ استعمال نہ کرے بلکہ خدا کی مِلک سمجھ کر صرف اُسکے قانون کی پابندی میں استعمال کرے۔ ہر چیز کو جو اسے حاصل ہے خدا کی امانت سمجھے اور یہ سمجھتے ہوئے اس میں تصرف کرے کہ مجھے اس امانت کا پورا حساب دینا ہے، اور حساب بھی اسکو دینا ہے جسکی نظر سے میرا کوئی فعل بلکہ کوئی دل میں چھپا ہوا ارادہ تک پوشیدہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص ہر حال میں ایک ضابطہ کا پابند ہو گا۔ وہ خواہشات کی بندگی میں کبھی شتر بے مہار نہیں بن سکتا۔ وہ ظالم اور خائن نہیں ہو سکتا۔ اُسکی سیرت پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ وہ ضابطہ کی پابندی کے لیے کسی خارجی دباؤ کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے نفس میں ایک زبردست اخلاقی انضباط پیدا ہو جاتا ہے جو اُسے اُن مواقع پر بھی راستی اور حق پر قائم رکھتا ہے جہاں اُسے کسی دنیوی طاقت کی بازپرس کا خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ خدا کا خوف اور امانت کا احساس وہ چیز ہے جس سے بڑھ کر سوسائیٹی کو قابلِ اعتماد افراد فراہم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ تصور میں نہیں آسکتا۔

مزید براں یہ نظریہ آدمی کو نہ صرف سعی و جہد کا آدمی بناتا ہے بلکہ اسکی سعی و جہد کو خود غرضی، نفس پرستی، یا قوم پرستی کے بجائے حق پرستی اور بلند تر اخلاقی مقاصد کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ جو شخص اپنے متعلق یہ رائے رکھتا ہو کہ میں دنیا میں بے کار نہیں آیا ہوں بلکہ خدا نے مجھے کام کرنے کے لیے یہاں بھیجا ہے، اور میری زندگی اپنے لیے یا اپنے دوسرے متعلقین کے لیے نہیں ہے بلکہ اُس کام کے لیے ہے جس میں خدا کی رضا ہو، اور میں یونہی چھوڑا نہ جاؤنگا بلکہ مجھ سے پورا حساب لیا جائیگا کہ میں نے اپنے وقت کا اور اپنی قوتوں کا کتنا اور کس طرح استعمال کیا، ایسے شخص سے زیادہ کوشش کرنے والا اور نتیجہ خیز اور صحیح کوشش کرنے والا آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ نظریہ ایسے بہتر افراد پیدا کرتا ہے کہ ان سے بہتر انفرادی رویہ کا تصور کرنا مشکل ہے۔

اب اجتماعی پہلو میں دیکھیے۔

سب سے پہلے تو یہ نظریہ انسانی اجتماع کی بنیاد بدل دیتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے تمام انسان خدا کی رعیت ہیں۔ رعیت ہونے کی حیثیت سے سب کے حقوق یکساں، سب کی حیثیت یکساں، اور سب کے لیے مواقع یکساں۔ کسی شخص، کسی خاندان، کسی طبقہ، کسی قوم، کسی نسل کے لیے دوسرے انسانوں پر نہ کسی قسم کی برتری و فوقیت ہے نہ امتیازی حقوق۔ اس طرح انسان پر انسان کی حاکمیت اور فضیلت کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور وہ تمام خرابیاں یک لخت دور ہو جاتی ہیں جو بادشاہی، جاگیرداری، نوابی (Aristocracy) اور برہمنیت و پاپائیت سے پیدا ہوتی ہیں۔

پھر یہ چیز قبائلی، قومی، نسلی، جغرافی اور لونی تعصبات کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے جنکی بدولت دنیا میں سب سے زیادہ خوں ریزیاں ہوئی ہیں۔ اس نظریہ کی رو سے تمام روئے زمین خدا کا ملک ہے، تمام انسان آدم کی اولاد اور خدا کے بندے ہیں، اور فضیلت کی بنیاد نسل و نسب، مال و دولت یا رنگ کی سپیدی و سرخی پر نہیں بلکہ اخلاق کی پاکیزگی اور خدا کے خوف پر ہے۔ جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے

والا اور صلاح و تقویٰ پر عمل کرنے والا ہے وہی سب سے افضل ہے۔

اسی طرح انسان اور انسان کے درمیان اجتماعی ربط و تعلق یا فرق و امتیاز کی بنا بھی اس نظریہ میں کلیتہً تبدیل کر دی گئی ہے۔ انسان نے اپنی ایجاد سے جن چیزوں کو اجتماع و افتراق کی بنا ٹھیرایا ہے وہ انسانیت کو بے شمار حصوں میں تقسیم کرتی ہیں اور اُن حصوں کے درمیان ناقابلِ عبور دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں کیونکہ نسل، یا وطن، یا قومیت یا رنگ وہ چیزیں نہیں ہیں جنکو آدمی تبدیل کر سکتا ہو اور ایک گروہ میں سے دوسرے گروہ میں جا سکتا ہو۔ برعکس اسکے یہ نظریہ انسان اور انسان کے درمیان اجتماع و افتراق کی بنا خدا کی بندگی اور اس کے قانون کی پیروی پر رکھتا ہے۔ جو لوگ مخلوقات کی بندگی چھوڑ کر خدا کی بندگی اختیار کریں اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا واحد قانون تسلیم کریں وہ سب ایک جماعت ہیں، اور جو ایسا نہ کریں وہ دوسری جماعت۔ اس طرح تمام اختلافات مِٹ کر صرف ایک اختلاف باقی رہ جاتا ہے اور وہ اختلاف بھی قابل عبور ہے۔ کیونکہ ہر وقت ایک شخص کے لیے ممکن ہے کہ اپنا عقیدہ اور طرز زندگی بدل دے اور ایک جماعت سے دوسری جماعت میں چلا جائے۔

اِن تمام بنیادی اصلاحات کے بعد جو سوسائٹی اِس نظریہ پر مبنی ہے اُسکی ذہنیت، اسپرٹ اور اجتماعی تعمیر (Social structure) بالکل بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں اسٹیٹ انسان کی حاکمیت پر نہیں بلکہ خدا کی حاکمیت پر بنتا ہے۔ حکومت خدا کی ہوتی ہے، قانون خدا کا ہوتا ہے، اور انسان صرف خدا کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہ چیز اول تو ان ساری خرابیوں کو دور کر دیتی ہے جو انسان پر انسان کی حکومت اور انسان کی قانون سازی سے پیدا ہوتی ہیں۔ پھر ایک عظیم الشان فرق جو اس نظریہ پر اسٹیٹ بننے سے واقع ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اسٹیٹ کے پورے نظام میں عبادت اور تقویٰ کی اسپرٹ پھیل جاتی ہے۔ راعی اور رعیت دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کی حکومت میں ہیں اور ہمارا معاملہ براہِ راست اُس خدا سے ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے۔ ٹیکس دینے والا یہ سمجھ کر

ٹیکس دیتا ہے کہ وہ خدا کو ٹیکس دے رہا ہے، اور ٹیکس لینے والے اور اس ٹیکس کو خرچ کرنے والے یہ سمجھتے ہوئے کام کرتے ہیں کہ یہ مال خدا کا مال ہے اور ہم امین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ایک سپاہی سے لے کر ایک جج اور گورنر تک ہر کارندۂ حکومت اپنی ڈیوٹی اُسی ذہنیت کے ساتھ انجام دیتا ہے جس ذہنیت کے ساتھ وہ نماز پڑھتا ہے۔ دونوں کام اسکے لیے یکساں عبادت ہیں۔ اور دونوں میں وہی ایک تقویٰ اور خشیت کی روح درکار ہے۔ باشندے اپنے اندر سے جن لوگوں کو خدا کی نیابت کا کام انجام دینے کے لیے چنتے ہیں اُن میں سب سے پہلے جو صفت تلاش کی جاتی ہے وہ خوفِ خدا اور امانت و صداقت کی صفت ہے۔ اس طرح سطح پر وہ لوگ اُبھر کر آتے ہیں اور اختیارات اُنکے ہاتھوں میں دیے جاتے ہیں جو سوسائٹی میں سب سے بہتر اخلاق کے حامل ہوتے ہیں۔

تمدن و معاشرت میں بھی یہ نظریہ وہی تقویٰ اور طہارت اخلاق کی اسپرٹ پھیلا دیتا ہے اس میں نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی ہوتی ہے، ہر ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان خدا کا واسطہ حائل ہوتا ہے، اور خدا کا قانون دونوں کے تعلقات کو منضبط کرتا ہے۔ یہ قانون چونکہ اس نے بنایا ہے جو تمام نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض سے پاک ہے، اور علیم و حکیم بھی ہے، اس لیے اس میں فتنے کا ہر دروازہ اور ظلم کا ہر راستہ بند کیا گیا ہے اور انسانی فطرت کے ہر پہلو اور اسکی ہر ضرورت کی رعایت کی گئی ہے۔

یہاں اتنا موقع نہیں کہ میں اُس پوری اجتماعی عمارت کا نقشہ پیش کروں جو اس نظریہ پر بنتی ہے۔ مگر جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اُس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیغمبروں نے جو نظریہ کائنات و انسان پیش کیا ہے وہ کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی نہیں کہ یہ محض کاغذ پر ایک خیالی نقشہ (Utopia) ہو، بلکہ تاریخ میں اس نظریہ پر ایک اجتماعی نظام اور ایک اسٹیٹ بنا کر دکھایا جا چکا ہے، اور تاریخ شاہد ہے کہ جیسے

افراد اس نظریہ پر تیار کیے گئے تھے نہ اُن سے بہتر افراد کبھی روئے زمین پر پائے گئے اور نہ اُس اسٹیٹ سے بڑھ کر کوئی اسٹیٹ انسان کے لیے رحمت ثابت ہوا۔ اس کے افراد میں اپنی اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک صحرائی عورت کو زنا سے حمل ہو جاتا ہے، وہ جانتی ہے کہ اس جرم کی سزا سنگساری جیسی ہولناک سزا ہے، مگر وہ خود چل کر آتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ اس پر سزا نافذ کی جائے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ وضع حمل کے بعد آئیو اور بغیر کسی مچلکہ وضمانت کے اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وضع حمل کے بعد وہ پھر صحرا سے آتی ہے اور سزا دیئے جانے کی درخواست کرتی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ بچہ کو دودھ پلا اور جب دودھ پلانے کی مدت ختم ہو جائے تب آئیو۔ پھر وہ صحرا کی طرف واپس چلی جاتی ہے اور کوئی پولیس کی نگرانی اس پر نہیں ہوتی۔ رضاعت کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ پھر آکر التجا کرتی ہے کہ اب اسے سزا دے کر اُس گناہ سے پاک کر دیا جائے جو اس سے سرزد ہو چکا ہے۔ چنانچہ اُسے سنگسار کیا جاتا ہے، اور جب وہ مرجاتی ہے تو اُس کے لیے دعائے رحمت کی جاتی ہے، اور جب ایک شخص کی زبان سے اس کے حق میں اتفاقاً یہ کلمہ نکل جاتا ہے کہ کیسی بے حیا عورت تھی تو جواب میں فرمایا جاتا ہے کہ خدا کی قسم اس نے ایسی توبہ کی تھی کہ اگر ناجائز محصول لینے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔ یہ تو اس سوسائٹی کے افراد کا حال تھا۔ اور اس اسٹیٹ کا حال یہ تھا کہ جب حکومت کی آمدنی کروڑوں روپے تک پہنچی ہوئی تھی، اور جس کے خزانے ایران و شام و مصر کی دولت سے معمور ہو رہے تھے اس کا صدر صرف ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ تنخواہ لیتا تھا اور اس کے شہریوں میں ڈھونڈے سے بھی بمشکل کوئی ایسا شخص ملتا تھا جو خیرات لینے کا مستحق ہو۔

اس تجربہ کے بعد بھی اگر کسی شخص کو یہ اطمینان حاصل نہ ہو کہ انبیاء نے نظام کائنات کی حقیقت اور اس میں انسان کی حیثیت کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ حق ہے تو ایسے شخص کے اطمینان کے

سے یہ کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہے، کیونکہ خدا اور فرشتوں اور آخرت کی زندگی کا براہِ راست عینی مشاہدہ تم سے بہرحال حاصل نہیں ہو سکتا۔ جہاں مشاہدہ ممکن نہ ہو وہاں تجربہ سے بڑھ کر صحت کا کوئی دوسرا معیار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک طبیب بیمار کے اندر مشاہدہ کر کے یہ نہیں دیکھ سکتا کہ فی الواقع سسٹم میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے تو وہ مختلف دوائیں دے کر دیکھتا ہے۔ اور جو دوا اس اندھیری کوٹھڑی میں ٹھیک نشانہ پر جا کر بیٹھتی ہے اُس کا مرض کو دور کر دینا ہی اس بات پر قطعی دلیل ہوتا ہے کہ سسٹم میں فی الواقع جو خرابی تھی یہ دوا اُسکے عین مطابق تھی۔ اسی طرح جب انسانی زندگی کی کل کسی دوسرے نظریہ سے درست نہیں ہوتی اور صرف انبیاء کے نظریہ ہی سے درست ہوتی ہے تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظریہ حقیقت کے مطابق ہے، فی الواقع یہ کائنات اللہ کی سلطنت ہی ہے اور واقعی اس زندگی کے بعد ایک زندگی ہے جس میں انسان کو اپنے کارنامۂ حیاتِ دنیوی کا حساب دینا ہے۔

سرورِ عالم

[یہ تقریر ۱؍اپریل سنہ ۴۸ء کو نشرگاہِ لاہور سے نشر کی گئی تھی اور آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے یہاں نقل کی جاتی ہے]

ہم مسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "سرورِ عالم" کہتے ہیں۔ سیدھی سادی زبان میں اس کا مطلب ہے "دنیا کا سردار"۔ ہندی میں اس کا ترجمہ "جگت گرو" ہوگا اور انگریزی میں (Leader of the world) بظاہر یہ بہت بڑا خطاب ہے مگر جس بلند پایہ ہستی کو یہ خطاب دیا گیا ہے اُس کا کارنامہ واقعی ایسا ہے کہ اُس کو سرورِ عالم کہنا مبالغہ نہیں عین حقیقت ہے۔

دیکھیے! کسی شخص کو دنیا کا لیڈر کہنے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہونی چاہیے کہ اُس نے کسی خاص قوم، یا نسل یا طبقہ کی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کیا ہو۔ ایک محب وطن یا ایک قوم پرست لیڈر کی آپ اس حیثیت سے جتنی چاہیں قدر کریں کہ اُس نے اپنے لوگوں کی بڑی خدمت کی، لیکن اگر آپ اسکے ہم وطن یا ہم قوم نہیں ہیں تو وہ آپکا لیڈر بہرحال نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کی محبت، خیر خواہی اور کارگزاری سب کچھ چین یا ہسپانیہ تک محدود ہو، مجھ ہندوستانی کو اس سے کیا تعلق کہ میں اسے اپنا لیڈر مانوں؟ بلکہ اگر وہ اپنی قوم کو دوسروں سے افضل ٹھیراتا ہو اور دوسروں کو گرا کر اپنی قوم کو چڑھانا چاہتا ہو تو میں اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں۔ ساری قوموں کے انسان کسی ایک شخص کو اپنا لیڈر صرف اسی صورت میں مان سکتے ہیں جبکہ اسکی نگاہ میں سب قومیں اور سب آدمی یکساں ہوں، وہ سب کا یکساں خیر خواہ ہو، اور اپنی خیر خواہی میں کسی طرح ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔

دوسری اہم شرط جو دنیا کا لیڈر ہونے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ایسے اصول پیش کیے ہوں جو تمام دنیا کے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہوں جس میں انسانی زندگی کے تمام اہم مسائل کا حل موجود ہو۔ لیڈر کے معنی ہی رہنما کے ہیں۔ لیڈر کی ضرورت ہوتی ہی اس لیے ہے کہ وہ فلاح اور بہتری کا راستہ بتائے۔ لہذا دنیا کا لیڈر وہی ہو سکتا ہے جو ساری دنیا کے انسانوں کو ایسا طریقہ بتائے جس میں سب کی فلاح ہو۔

تیسری لازمی شرط دنیا کا لیڈر ہونے کے لیے یہ ہے کہ اسکی رہنمائی کسی خاص زمانے کے لیے نہ ہو بلکہ ہر زمانے اور ہر حال میں یکساں مفید، یکساں صحیح اور یکساں قابلِ پیروی ہو۔ جس لیڈر کی رہنمائی ایک زمانہ میں کار آمد اور دوسرے زمانہ میں بیکار ہو اسکو دنیا کا لیڈر نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کا لیڈر تو وہی ہے کہ دنیا جب تک قائم رہے اسکی رہنمائی بھی کار آمد رہے۔

چوتھی اہم ترین شرط یہ ہے کہ اس نے صرف اصول پیش کرنے ہی پر اکتفا نہ کی ہو بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کو زندگی میں عملاً جاری کر کے دکھایا ہو اور انکی بنیاد پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی پیدا کردی ہو۔ محض اصول پیش کرنے والا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر (Thinker) ہو سکتا ہے، لیڈر نہیں ہو سکتا۔ لیڈر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اصولوں کو عمل میں لا کر دکھائے۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ یہ چاروں شرطیں اس ہستی میں کہاں تک پائی جاتی ہیں جس کو ہم سرورِ عالم کہتے ہیں۔

پہلی شرط کو پہلے لیجیے۔ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ایک ہی نظر میں محسوس کر لیں گے کہ یہ کسی قوم پرست یا محبِ وطن کی زندگی نہیں ہے بلکہ ایک محبِ انسانیت اور ایک عالمگیر نظریہ رکھنے والے انسان کی زندگی ہے۔ اُن کی نگاہ میں تمام انسان یکساں تھے۔ کسی خاندان، کسی طبقے، کسی قوم، کسی نسل، یا کسی ملک کے خاص مفاد سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ امیر اور غریب

اونچ اور نیچ، کالے اور گورے، عرب اور غیر عرب، مشرقی اور مغربی، سامی اور آرین، سب کو وہ اس حیثیت سے دیکھتے تھے کہ یہ سب ایک ہی انسانی نسل کے افراد ہیں۔ اُنکی زبان سے تمام عمر کوئی ایک لفظ یا ایک فقرہ بھی ایسا نہ نکلا، اور نہ زندگی بھر میں کوئی کام انہوں نے ایسا کیا جس سے یہ شبہ کیا جاسکتا ہو کہ انہیں ایک طبقۂ انسانی کے مقابلہ میں دوسرے طبقۂ انسانی کے مفاد سے زیادہ تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی زندگی ہی میں حبشی، ایرانی، رومی، مصری اور اسرائیلی اُسی طرح اُنکے رفیق کار بنے جس طرح عرب، اور اُنکے بعد زمین کے ہر گوشے میں ہر نسل اور ہر قوم کے انسانوں نے اُنکو اُسی طرح اپنا رہنما تسلیم کیا جس طرح خود اُنکی اپنی قوم نے۔ یہ اِسی خالص انسانیت ہی کا کرشمہ تو ہے کہ آج آپ ایک ہندوستانی کی زبان سے اُس شخص کی تعریف سُن رہے ہیں جو صدیوں پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا۔

اب دوسری اور تیسری شرط کو ایک ساتھ لیجیے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص قوموں اور مخصوص ملکوں کے وقتی اور مقامی مسائل سے بحث کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی پوری قوت دنیا میں انسانیت کے اُس بڑے مسئلے کو حل کرنے پر صرف کردی جس سے تمام انسانوں کے سارے چھوٹے چھوٹے مسائل خود حل ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑا مسئلہ کیا ہے؟ وہ صرف یہ ہے کہ کائنات کا نظام فی الواقع جس اصول پر قائم ہے، انسان کی زندگی کا نظام بھی اُسکے مطابق ہو کیونکہ انسان اِس کائنات کا ایک جزء ہے اور جزء کی حرکت کا کل کے خلاف ہونا ہی خرابی کا موجب ہے۔ اگر آپ اس بات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اسکی آسان صورت یہ ہے کہ اپنی نگاہ کو ذرا کوشش کرکے زمان اور مکان کی قیود سے آزاد کر لیجیے اور پورے کرۂ زمین پر اس طرح نظر ڈالیے کہ ابتدا سے آج تک اور آئندہ غیر محدود زمانہ تک بسنے والے تمام انسان بیک وقت آپکے سامنے ہوں۔ پھر دیکھیے کہ انسان کی زندگی میں خرابی کی جتنی صورتیں پیدا ہوئی ہیں یا ہونی ممکن ہیں اُن سب کی جڑ کیا ہے یا کیا ہو سکتی ہے۔ اس سوال پر آپ جتنا غور کرینگے، جتنی چھان بین اور تحقیق کرینگے، حاصل یہی نکلے گا کہ انسان کی خدا سے بغاوت تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسلیے کہ خدا سے

باغی ہوکر انسان لازمی طور پر دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت اختیار کرتا ہے: یا تو وہ اپنے آپ کو خود مختار اور غیر ذمہ دار سمجھ کر من مانی کارروائیاں کرنے لگتا ہے اور یہ چیز اُسے ظالم بنا دیتی ہے یا پھر وہ خدا کے سوا دوسروں کے حکم کے آگے سر جھکانے لگتا ہے اور اس سے دنیا میں فساد کی بے شمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ خدا سے بے پروا ہو کر یہ خرابیاں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا چونکہ حقیقت کے خلاف ہے اس لیے اس کا نتیجہ برا نکلتا ہے۔ یہ ساری کائنات فی الواقع خدا کی سلطنت ہے۔ زمین، سورج، چاند، ہوا، پانی، روشنی سب خدا کی ملک ہیں۔ اور انسان اس سلطنت میں پیدائشی بندے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پوری سلطنت جس نظام پر قائم ہے اور جس نظام پر چل رہی ہے، اگر انسان اسکا ایک جزو ہونے کے باوجود اس سے مختلف رویہ اختیار کرے تو لامحالہ اس کا ایسا رویہ تباہ کن نتائج ہی پیدا کریگا۔ اس کا یہ سمجھنا کہ مجھ سے اوپر کوئی مقتدر اعلیٰ نہیں ہے جسکے سامنے میں جواب دہ ہوں، واقعہ کے خلاف ہے۔ اسلیے جب وہ خود مختار بن کر غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر کام کرتا ہے اور اپنا قانون زندگی آپ تجویز کرتا ہے تو نتیجہ برا نکلتا ہے۔ اسی طرح اُس کا خدا کے سوا کسی اور کو صاحب اختیار و اقتدار ماننا اور اس سے خوف یا لالچ رکھنا اور اسکی آقائی کے آگے جھک جانا بھی حقیقت کے خلاف ہے، کیونکہ فی الحقیقت اس پوری کائنات میں خدا کے سوا کوئی بھی یہ حیثیت نہیں رکھتا، لہٰذا اس کا نتیجہ بھی برا ہی نکلتا ہے۔ صحیح نتیجہ برآمد ہونے کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ زمین اور آسمان میں جو حقیقی حکومت ہے، انسان اسکے سامنے سر جھکا دے، اپنی خودی و خودسری کو اُسکے آگے تسلیم کردے، اپنی اطاعت اور بندگی کو اسکے لیے خالص کردے، اور اپنی زندگی کا ضابطہ و قانون خود بنانے یا دوسروں سے لینے کے بجائے اُس سے لے۔

یہ بنیادی اصلاح کی تجویز ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے لیے پیش کی ہے

یہ مشرق اور مغرب کی قید سے آزاد ہے - روئے زمین میں جہاں جہاں انسان آباد ہیں، یہی ایک اصلاحی تجویز انکی زندگی کی بگڑی ہوئی کل کو درست کر سکتی ہے - اور یہ ماضی و مستقبل کی قید سے بھی آزاد ہے - ڈیڑھ ہزار برس پہلے یہ جتنی صحیح اور کارگر تھی اتنی ہی آج بھی ہے اور اتنی ہی دس ہزار برس بعد بھی ہوگی

اب آخری شرط باقی رہ جاتی ہے - یہ تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف خیالی نقشہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ اس نقشہ پر ایک زندہ سوسائیٹی پیدا کر کے دکھا دی - انہوں نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں لاکھوں انسانوں کو خدا کی حکومت کے آگے سر اطاعت جھکانے پر آمادہ کر لیا، اُن سے خود پرستی بھی چھڑوا دی اور خدا کے سوا دوسروں کی بندگی بھی، پھر اُنکو جمع کر کے خالص خدا کی بندگی پر ایک نیا نظام اخلاق، نیا نظام تمدن، نیا نظام معیشت، اور نیا نظام حکومت بنایا، اور تمام دنیا کے سامنے اس بات کا عملی مظاہرہ کر دیا کہ جو اصول وہ پیش کر رہے ہیں اس پر کیسی زندگی بنتی ہے اور دوسرے اصولوں کی زندگی کے مقابلہ میں وہ کتنی اچھی، کتنی پاکیزہ اور کتنی صالح ہے -

یہ وہ کارنامہ ہے جسکی بنا پر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرورِ عالم یا دنیا کا لیڈر کہتے ہیں - اُن کا یہ کام کسی خاص قوم کے لیے نہ تھا، تمام انسانوں کے لیے تھا - یہ انسانیت کی مشترک میراث ہے جس پر کسی کا حق کسی دوسرے سے کم یا زیادہ نہیں ہے - جو چاہے اس میراث سے فائدہ اٹھائے - میں نہیں سمجھتا کہ اسکے خلاف کسی کو تعصب رکھنے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے -

---

ہماری ایجنسی !

اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاحِ عالم

از جناب حکیم محمدؐ اسحاق صاحب سندیلوی

ریاست (state) ایک مخصوص قسم کی ہیئت اجتماعیہ کا نام ہے۔ ہیئت اجتماعیہ کے وجود میں آنیکی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ پہلی صورت حیوانیت کے طبعی ارتقار کی ایک منزل ہے۔ جس طرح متعفن اشیاء میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں، جس طرح آب و گل اور تخم کے اجتماع سے خودرو پودے پیدا ہو جاتے ہیں اور جس طرح تیز و تند ہواؤں کے عمل سے ریگستانوں میں ریگ کے ٹیلے بنجاتے ہیں، اسی طرح زمانہ کے آغوش میں محض جذبات حیوانی اور ماحول کے مقتضاء سے مختلف اور متفرق افراد انسانی میں ایک ہیئتہ اجتماعیہ پیدا ہو جاتی ہے جسکو وہ اپنی قومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی ہیئت اجتماعیہ میں بعض خصوصیات کا اضافہ کر کے اسکو ریاست کا نام دیدیا جاتا ہے۔ لیکن پیدا ہوتی ہے یہ اسی حیوانیت سے جس سے ایسی قوموں کے کل حرکات و سکنات ناشی ہوتے ہیں۔ ایسی قومیں اگر بھیڑوں سے جمہوریت کی تعلیم حاصل کرتی ہیں تو بھیڑیوں سے آمریت کا سبق سیکھتی ہیں۔ انکے علم و عمل دونوں کا ذریعہ ماحول، زمانہ، جذبات اور خواہشوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

راحت و فلاح، قیام و بقاء ایسی جماعتوں اور قوموں کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتی۔ انکی زندگی انکے لیے موت سے تلخ تر ہوتی ہے اور انکی موت پر نہ آسمان روتا ہے نہ زمین کے آنسو نکلتے ہیں۔ اور بہت تھوڑے عرصہ میں وہ اپنے ہی اعمال کے ثمرہ کے طور پر موت و فنا کے قعر عمیق میں دھکیل دی جاتی ہیں۔ وہ زمانہ کے بحرِ زخار میں بلبلوں کی طرح پیدا ہوتی ہیں اور اپنی مختصر عمر

پریشانی، حیرانی اور مصائب میں گذار کر ساحل سے سر ٹکرا کر فنا ہو جاتی ہیں۔ نہ اُن کا کوئی مقصدِ حیات ہوتا ہے نہ مرام زندگی۔ نہ انکو اپنے نقطۂ آغاز کا علم ہوتا ہے نہ نقطۂ انجام کا۔ نہ وہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا	اُنکے پاس دل ہیں مگر وہ اُن سے سمجھتے نہیں ہیں
وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا	اُنکے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں ہیں
وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا	اُنکے پاس کان ہیں مگر وہ اُن سے سُنتے نہیں ہیں
أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ	وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

یورپ کے "ترقی یافتہ حیوانات"[1]، اُنکے سیاسی و اجتماعی تصورات اور اُنکے نتائج مثال کے لیے بہت کافی ہیں۔ ورنہ دراصل توامت مسلمہ کے سوا ہر قوم، اور ریاست کے اسلامی تصور کے سوا ہر تصور اسی حیوانیت کی پیداوار ہوتا ہے۔ حال اور ماضی دونوں میں یہ چیز صاف صاف نظر آتی ہے اور عقل و تجربہ دونوں اس کی کھلی ہوئی شہادت دیتے ہیں کہ اجتماع و سیاست کے متعلق جتنے نظریات آج تک دنیا کے سامنے پیش کئے گئے ہیں اور جن پر دنیا نے عمل کیا ہے ان میں سے ایک بھی بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اور راحت و طمانیت کا سبب نہیں بن سکا اور نہ بن سکتا ہے۔ جمہوریت ہو یا آمریت، سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت، سب اسی حیوانیت اور بہیمیت کے مظاہر ہیں۔ انکی شکلیں مختلف ہیں مگر حقیقت سب کی ایک ہے یعنی خدائے بے نیاز سے بے نیازی و بغاوت اختیار کر کے اُس انسان کی حکومت قائم کرنا جسکی حقیقت ان ارباب تحقیق کے نزدیک یہ ہے کہ وہ بس ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔

---

[1] یہ لقب خود اہلِ یورپ کا محبوب و پسندیدہ ہے اسلیے کہ انکے نزدیک انسان کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وہ ایک ترقی یافتہ حیوان ہے

انسان کی فرمانروائی (Sovereignty) بنیاد ہے کل غیر اسلامی سیاسی تصورات و نظریات کی۔ یہ بنیاد اس قدر کمزور، مہمل، خلافِ عقل اور احمقانہ ہے کہ اسکے اوپر جو عمارت بھی تعمیر کی جائیگی وہ نہ صرف خود بہت جلد منہدم ہو جائیگی بلکہ تعمیر کرنے والوں کو بھی اپنے ملبہ میں ابدالآباد کے لیے دفن کر دیگی۔ چنانچہ آج یورپ کے ترقی یافتہ حیوانات میں حیوانیت و بہیمیت کا جو مقابلہ ہو رہا ہے اور جس طرح بنی آدم کے خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے وہ طبعی نتیجہ ہے اسی انسانی حکومت کے جاہلی نظریہ حیات، اور غیر اسلامی طرزِ تخیل کا۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ — خشکی اور تری میں فساد پھوٹ پڑا ہے لوگوں کے اپنے کرتوتوں سے۔

تہذیب مغرب کے شجرۂ خبیثہ میں پھل آنے شروع ہو گئے ہیں۔ ان مہذب حیوانات کو یہ کڑوے پھل کھانے پڑینگے اور پیٹ بھر کر کھانے پڑینگے۔

ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيُّهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ لَآكِلُونَ مِنْ شَجَرٍ مِنْ زَقُّومٍ فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ — پھر اے تکذیب کرنے والے گمراہ لوگو! تم کو زقوم کھانا پڑے گا اور پیٹ بھر کر کھانا ہوگا۔

اس زقوم تلخ کا بیج تو تم نے ہی بویا تھا، اب اس کے پھل کھانے سے کیوں گھبراتے ہو؟ یہ سب اسی تہذیب کا نتیجہ ہے جسکو پھیلانے کے لیے تم نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کر دیا تھا یہ سب اسی انسانی فرمانروائی ہی کا تو اثر ہے جس کا قائم کرنا تمہاری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ پھر اسکی تعمیر ہی اسکی تخریب کی ضامن ہے اور تم کو بھی آج تباہی میں اس کا ساتھ دینا چاہیے جس طرح زندگی میں اس کا ساتھ دیتے رہے ہو۔ فکیف آسیٰ علیٰ قوم کافرین۔

خدا جانے یہ کہاں کا انصاف اور کس عقل کا اقتضا ہے کہ انسانوں کے ایک بہت بڑے

گروہ کو انہی سے کے مثل ایک انسان یا ایک چھوٹی سی انسانی جماعت کا محکوم بنا دیا جائے اور انسان کو انسان کا فرمانروا قرار دیدیا جائے؟ پھر عقل تو یہ بتاتی ہے کہ انسانی فہم قوانین کو سمجھ تو سکتی ہے، مگر انکو بنا نہیں سکتی۔ فہمِ قانون اور شے ہے اور وضع قانون بالکل ایک دوسری شے۔ خلاقِ عقول نے انسانی عقل کو یہ طاقت ہی نہیں عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنے لیے یا دوسروں کے لیے قوانین وضع کر سکے۔ ہم نے تکرارِ مشاہدہ سے معلوم کیا کہ پانی گیہوں کے لیے مفید ہے۔ اس لیے ہم نے یہ قانون بنا لیا کہ گیہوں میں پانی دینا چاہیے۔ لیکن درحقیقت ہم نے کوئی قانون وضع نہیں کیا ہے بلکہ جو قانون قدرت تھا اُسے صرف دریافت کیا ہے۔ ان قوانین کی وضع پر انسان کا قادر نہ ہو بالکل بدیہی چیز اور مسلمہ مسئلہ ہے۔

قانون کی دوسری قسم وہ ضوابط ہیں جو کسی فرد یا جماعت کے حق کو وجود میں لاتے ہیں یا اسکی حفاظت کرتے ہیں یا اسکو سلب کرتے ہیں۔ سیاسی مباحث میں لفظ قانون زیادہ تر اسی مفہوم میں مستعمل ہے۔ اس قسم کے قوانین کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ ان کا وضع کرنا انسانی عقل کی قدرت سے باہر ہے۔ اس عدم قدرت سے ہماری یہ مراد ہے کہ چونکہ انسانی عقل کی طاقت انکو صحیح وضع کرنے سے قاصر ہے اسلیے اس قسم کے قوانین اگر بنائے جائینگے تو وہ یقیناً غلط ہونگے۔ یعنی انکی وضع کی حقیقی غرض و غایت ان سے ہرگز نہ پوری ہو سکے گی بلکہ وہ انسانوں کے لیے بجائے مفید ہونے کے مضرت رساں ثابت ہونگے۔ اس مقصد کے اثبات کے لیے مندرجہ ذیل دلائل کافی ہیں:

(۱) سطور بالا میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قانون اُس ضابطہ کا نام ہے جو کسی فرد یا جماعت کے حق کو وجود میں لائے یا اسکی حفاظت کرے یا اسکو سلب کرے۔ قانون کی یہ تعریف بہت جامع و مانع ہے۔ اس تعریف پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وضع قانون کے لیے واضع کو

مندرجہ ذیل امور کا علم ضروری و لابدی ہے:

(۱) حق کا مفہوم (۲) مختلف اشخاص کی صحیح فطرت اور قوت تاثر کا علم تاکہ قانون کی تاثیرات کا صحیح اندازہ کیا جاسکے (۳) ان سب جزئیات کا علم جو قانون کے دائرۂ عمل میں آنے والے ہیں تاکہ انکے قدر مشترک کو صحیح طور پر قانون میں داخل کیا جاسکے۔

حق کا مفہوم کیا ہے؟ اسکی صحیح تعیین سے انسانی عقل اپنے عجز کا ثبوت دے چکی ہے ازمنۂ قدیمہ میں طاقت اور حق مترادف سمجھے جاتے تھے۔ جسکی لاٹھی اسکی بھینس پرانی مثل ہے اور آج بھی اسی اصول پر عمل ہو رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اب اسکی تعبیر کے لیے مہذب اور شستہ الفاظ اختیار کر لیے گئے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرنیکے لیے صرف دو ہی راستے ملتے ہیں۔ ایک طبعی طریقہ دوسرا رسمی طریقہ۔ اگر ہم طبعی قوانین کو پیشِ نظر رکھ کر خالص سائنٹفک نقطۂ نظر سے حق کے مفہوم کو تلاش کرتے ہیں تو بقاء اصلح Survival of the fittest کا اصول ہماری رہنمائی کرتا ہے اور حق اور طاقت دونوں مترادف ٹھیرتے ہیں اور اگر رسم و رواج، یا بقول آسٹن جماعت کے اخلاقی تصور کی روشنی میں اسکا چہرہ دیکھیں تو بھی جسکی لاٹھی اسکی بھینس ہی کی مثل حق کا عنوان نظر آتی ہے۔ (دیکھو جان آسٹن کی کتاب Jurisprudence)۔ بلکہ اس صورت میں چونکہ جماعت کا اخلاقی تصور ایک تغیر پذیر شے ہے اس لیے حق کا مفہوم اور بھی زیادہ غیر متعین ہو جاتا ہے۔ الغرض یہ سوال کہ وہ کونسی شے ہے جسکی بناء پر کسی انسان کے دوسرے انسان کے افعال پر اثر انداز ہونے کو عقلاً جائز کہا جاسکتا ہے، اب تک ناقابلِ حل ہے، اس لیے کہ اس کا صرف ایک جواب پیش کیا گیا ہے اور مادی طرز استنتاج سے صرف وہی جواب ہو سکتا ہے، یعنی "طاقت و قدرت"، مگر انسان کی عقل اور فطرت دونوں اس جواب کو صحیح ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور دونوں اسکو غلط و گمراہ کن قرار دیتی ہیں۔ لہذا بالآخر یہ ماننا پڑیگا کہ یہ سوال ابھی تک

لا یحل ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ڈاکوؤں کا گروہ جو سلب و نہب کی طاقت رکھتا ہے، محض طاقت کی بنا پر اسکے ان افعال کو کوئی عاقل جائز نہیں قرار دے سکتا۔

یہاں سب اشخاص کی صحیح فطرت اور جہت تاثر کا علم اور ان کل جزئیات کا علم جو قانون کے تحت میں داخل ہونے والی ہیں تو یہ اور بھی ناممکن ہے۔ اولاً اس لیے کہ اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اسے دے کے اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ استقرا ہے جو علم دیقین نہیں پیدا کر سکتا۔ ثانیاً اس لیے کہ انسان احوال کا غلام ہوتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات سے اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی فطرت کو اپنی ہی فطرت پر قیاس کر لیتا ہے اور علیٰ ہذا اسکے سامنے جو افراد و جزئیات موجود ہوتے ہیں انہیں پر آئندہ جزئیات کو قیاس کر لیتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی ساخت کے تمام قوانین اسی قسم کی کمزوریوں سے لبریز ہیں۔ اور نہ صرف انکی جامعیت معرض زوال میں ہے بلکہ انکی افادیت بھی غیر متعین ہے۔

الغرض وضع قانون کے لیے جن چیزوں کا علم ضروری و لابدی ہے ان میں سے ایک کا علم بھی انسان نہیں حاصل کر سکتا جسکا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ وہ قانون وضع کرنے سے قاصر ہے۔

(۲) قانون کی جو تعریف بھی کیجیے ہر صورت میں یہ ماننا پڑیگا کہ قانون ایک ایسے اصول کا نام ہے جو انسان کے خیالات، اخلاق یا اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کے صرف یہی تین اجزاء ہیں، اس لیے جو قانون بھی وضع کیا جائیگا اسکا تعلق یا تو انسانی خیالات سے ہوگا یا اسکے اخلاق سے یا اسکے اعمال و افعال سے۔ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جن سے انسان خود متاثر ہوتا ہے اور اسقدر متاثر ہوتا ہے کہ بالکل انہی کے تابع رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ان اجزاء زندگی کے لیے وہ خود کوئی قانون کسطرح وضع کر سکتا ہے؟ قانون وضع کرنیکے معنی تو یہی ہونگے کہ زندگی کے یہ اجزائے ثلثہ واضع قانون کے تابع ہوں، مگر جبکہ واضع قانون خود ان کا تابع ہے تو یہ اس کے تابع

کیسے ہو سکتے ہیں؟ بنا بریں یہ ناممکن ہے کہ انسان اپنے خیالات، اعمال، یا اخلاق، کے لیے کوئی قانون وضع کر سکے۔ دراصل جو چیز قانون کی شکل میں اسکے ذہن میں آتی ہے وہ ایک فطری اثر اور نتیجہ ہوتا ہے انہیں اجزائے ثلاثہ میں سے کسی گذشتہ یا موجودہ جزو کا یا کل اجزا کا۔

(۳) ایک انسان کو بدو طفولیت سے کسی ایسے مقام پر قید کر دیا جائے جہاں کسی دوسرے انسان کی صحبت اس کو میسر نہ ہو سکے اور تعلیم و تعلم کے کل ذرائع اس کے لیے مسدود کر دیئے جائیں ایسا آدمی جوان بلکہ بوڑھا ہو کر بھی قطعاً لا یعقل اور جاہل محض رہیگا اور دوسروں کے لیے تو بڑی بات ہے اپنی انفرادی زندگی کے لیے بھی کوئی قانون وضع نہیں کر سکیگا۔ البتہ چند قوانین پر عمل پیرا ضرور ہوگا۔ ان قوانین میں سے بعض تو وہ ہونگے جن پر وہ جبلی طور پر محض مجبورانہ عامل ہوگا مثلاً اشتہا کے وقت غذا کھانا، پیاس کے وقت پانی پی لینا، سردی و گرمی سے بچنے کا انتظام کرنا۔ اور بعض قوانین وہ ہونگے جو طبعی قوانین سے اس نے مستنبط کیے ہونگے۔ بہرحال وہ کوئی قانون وضع نہیں کر سکتا صرف استنباط کر سکتا ہے۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی عقل کو فطرتاً یہ قوت نہیں دی گئی ہے کہ وہ کوئی قانون وضع کر سکے۔ البتہ استنباط قوانین کی قدرت اسکو عطا کی گئی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان کی تعلیم و تربیت جب کی جاتی ہے تو جسکے معنی یہ ہیں کہ جب اسکو معلوم شدہ قوانین بتائے جاتے ہیں اور طبعی قوانین کی جانب اسکی توجہ منعطف کرائی جاتی ہے تو وہ ان قوانین کو سیکھتا ہے اور اسکے ساتھ ہی ساتھ ان قوانین سے دوسرے قوانین مستنبط بھی کر لیتا ہے۔ اسی استنباط کو مدعیان عقل و دانش اپنی خوش فہمی سے وضع قانون سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اسکی حقیقت محض استنباط ہے۔

واضح رہے کہ تعلیم و تربیت انسان کی فطری قوتوں کو نشو و نما تو دے سکتی ہے لیکن اس میں کوئی جدید قوت پیدا نہیں کر سکتی۔ اسلیے جب وضع قانون کی قوت انسان میں فطری طور پر

موجود ہی نہیں ہے تو تعلیم و تربیت کی بہتر سے بہتر صورت بھی اس میں اس قدرت کی تخلیق نہیں کرسکتی۔ اب یہ امر بالکل صاف ہوگیا کہ وضع قانون کا حق مخصوص ہے اس خلاق عظیم کے ساتھ جس نے انسان، اسکی فطرت، اسکے اعمال اور افعال سب کو پیدا کیا ہے۔ وہی ان سب چیزوں کا کماحقہٗ علم رکھ سکتا ہے اور وہی ان کے لیے قانون وضع کرسکتا ہے۔

پھر جب انسان میں وضع قانون کی قوت ہی نہیں ہے تو وہ اگر اسکی کوشش کریگا تو یقیناً غلطی کریگا اور یقیناً اسکی عقل اس غیر معمولی اور اپنی قوتِ برداشت سے زائد بوجھ کو اٹھانے کی وجہ سے ضعیف ہو کر سخافت و سفاہت کے درجہ تک گر جائیگی۔ اس کا واضح مشاہدہ ہم یورپ کے ترقی یافتہ حیوانات کی حکمت آرائیوں میں کرسکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنی استعداد سے بڑھ کر کام کرنیکا نتیجہ پریشانی تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد کہ انسان کو وضع قانون کی قوت حاصل نہیں ہے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ انسان فرمانروا بھی نہیں بن سکتا۔ یہی وہ خط فاصل ہے جو ابتداء اور بنیاد ہی سے اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست میں فرق و امتیاز پیدا کر دیتا ہے اور اتنا فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ان دونوں میں کسی مقام پر بھی اتصال و اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اسلامی ریاست کا بنیادی اصول غیر اللہ کی فرمانروائی کی نفی کامل اور محض اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی کا کامل اثبات ہے۔ اور غیر اسلامی ریاست کا سنگِ بنیاد انسانی فرمانروائی ہے۔ اسلام لا الٰہ کی تعلیم دے کر ہر غیر اللہ کی فرمانروائی کی نفی کر دیتا ہے اور الا اللہ کی تعلیم دے کر فرمانروائی کو ذات حق سبحانہٗ کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے۔ اس کا بنیادی اصول ہے ان الحکم اِلَّا لِلّٰہ حکومت و فرمانروائی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو پہنچتا ہے۔

(۱) ذالکم اللّٰہ ربکم لہ الملک — وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے بادشاہی صرف اسی کی ہے۔

(۲) لم یکن لہ شریک فی الملک — اسکی بادشاہی میں کوئی اسکا شریک نہیں ہے۔

(۳) الا لہ الخلق والامر خبردار ہو جاؤ اسی کے لیے خلق اور امر دونوں مخصوص ہیں۔

(۴) ولا یشرک فی حکمہ احداً وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں بناتا۔

مندرجہ بالا آیات اور انکے علاوہ اور متعدد کثیر آیات اس چیز کو واضح کرتی ہیں کہ اسلام غیراللہ کی حکمرانی قطعاً ناجائز قرار دیتا ہے اور اسکو کسی حالت میں بھی روا نہیں رکھتا۔ صرف اسلامی ریاست ہی کا نہیں خود اسلام کا سنگ بنیاد بھی یہی اصول ہے۔ اسلام نام ہی ہے حکومت الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی میں داخل ہو جانیکا۔ اس لیے اس اصول کو چھوڑ کر اور غیر اللہ کی فرمانروائی کو جائز قرار دینے کے بعد سرے سے اسلام کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ افسوس اور حیرت ہے ان زعمار ملت پر جو چیخ چیخ کر مسلمانوں کو جمہوریت اور مشترک وطنی حکومت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اسلام کا رشتہ انسانی فرمانروائی سے جوڑتے ہیں۔

اسلامی نظام حکومت کے برعکس سیاست و ریاست کے متعلق جسقدر غیر اسلامی نظریات اب تک پیش کیے گئے ہیں اور جسقدر قیامت تک پیش کیے جائینگے ان سب میں انسانی فرمانروائی کا نظریہ مشترک اور اہم ترین جزو ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں ہم نے اصولی حیثیت سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ چیز سرے سے غلط ہے اور یہ کہ فرمانروائی کا حق مخصوص بذات حق سبحانہ ہے۔ انسانی فرمانروائی کے ابطال کے بعد ہر غیر اسلامی سیاسی نظریہ کا باطل ہونا قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے خواہ وہ جمہوریت ہو یا مطلقیت یا دنیا کا اور کوئی سیاسی نظریہ۔ اس لیے اب اسکی حاجت نہیں ہے کہ ہر ایک غیر اسلامی سیاسی نظریہ کو علحدہ علحدہ باطل کیا جائے۔ تاہم مزید توضیح اور اتمام حجت کے لیے ہم ان سب پر علحدہ علحدہ بھی تنقید کر کے انکی غلطی قطعی طور پر واضح کیے دیتے ہیں تاکہ اس دور کشمکش میں جب کہ نظریات کا تصادم نہایت شدت کے ساتھ صرف ذہنوں، زبانوں اور کاغذوں ہی پر نہیں بلکہ جنگ کے میدانوں میں بھی ہو رہا ہے لوگ صحیح مقصد کا تعین کر سکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ

خدا سے بے نیاز ہو کر جو نظریہ بھی قائم کیا گیا ہے ایک لعنت ہے جس سے جس قدر جلد چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اسی قدر بہتر ہے اور عالم کی صلاح و فلاح کا ایک اور صرف ایک ذریعہ یہی ہے کہ وہ اسلام کے سیاسی نظریے کو قبول کرے یعنی غیر اللہ کی فرمانروائی کو مٹا کر محض اللہ تعالیٰ کی حکومت و فرمانروائی قبول کرے۔

تاریخی پہلو

ریاست جو سب سے اہم اجتماعی ادارہ ہے اسکی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس سوال کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں اور یورپ کے فلاسفہ کے اس مسئلہ پر مختلف اقوال و خیالات ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ خاندان اولین معاشرہ ہے جو دنیا میں پیدا ہوا اور اس قسم کے مختلف معاشروں کے باہمی اجتماع سے طبعی طور پر ریاست وجود میں آگئی۔ کوئی کہتا ہے کہ خوف و دہشت کے جذبہ سے متاثر ہو کر مختلف اور متفرق انسانی افراد ریاست کو وجود میں لانے پر مجبور ہو گئے کسی کا قول ہے کہ ریاست افراد انسانی میں ایک اجتماعی معاہدہ (Social contract) کا نتیجہ ہے۔ غرض اس سلسلہ میں بکثرت اور مختلف باتیں کہی جاتی ہیں اور ان سب کا محور ایک خیال ہے یعنی حقیقت انسانی کے متعلق یہ مفروضہ کہ وہ ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک جس طرح بیل بکری اگائے بھینس وغیرہ کے افعال و حرکات انکے ضروریات و ماحول کے لحاظ سے ہوتے ہیں اسی طرح انسانی افعال بھی انہی چیزوں کے تابع ہوتے ہیں۔ مقصد سب کا یہی ہے محض بیانات کا فرق ہے۔ اور یہ فرق بھی اس لیے ہے کہ کسی نے انسان کی بالکل ابتدائی (مفروضہ) حالت سے ریاست کی تاریخ کی ابتدا کی ہے اور کسی نے بعض درمیانی مدارج سے اسکو شروع کیا ہے۔

قرآن مجید اگرچہ فن تاریخ کی کتاب نہیں ہے اور نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کوئی مورخ تھے، لیکن چونکہ شرف و فلاح انسانی سے اس مسئلہ کا تعلق ہے اسلیے اسلام نے اس

مسئلہ کے تاریخی پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ قرآن مجید کا بیان یہ ہے کہ انسان دنیا میں خلافتِ الٰہی کی نعمت اپنے ساتھ لے کر آیا تھا بلکہ تخلیق آدم علیہ السلام کا مقصد ہی خلافت الٰہیہ کا قیام تھا۔ اس مرتبۂ عظمیٰ کے ساتھ انسان کو اس کی ابتدا، آفرینش ہی میں نوازا گیا اور سب سے پہلے خلیفۃ اللہ فی الارض حضرت آدم علیہ السلام ہیں جو دنیا کے سب سے پہلے انسان بھی تھے۔ یہ ہے ہیئتِ اجتماعیہ کے وجود میں آنے کی دوسری صورت جو اول الذکر صورت سے بالکل متضاد ہے اور جس کی بنیاد عقلی و فطری اصول اور تشریعی و الٰہی احکام و علوم پر قائم ہے۔

لیکن اسلام اس کا منکر نہیں ہے کہ ریاست نے اپنے ارتقائی مدارج طبعی و حیوانی منہاج پر طے کیے ہیں۔ بلاشبہ ایسا ہوا ہے۔ مگر ریاست کی حقیقی ابتدا اس صورت سے نہیں ہوئی ہے بلکہ اولادِ آدم علیہ السلام کے پھیلنے کے بعد جذبات اور ماحول، نفس اور شیطان کے وساوس کا شکار ہو کر ایک کثیر انسانی جماعت نے ریاست کے اسلامی تصور کو بھلا دیا اور غیر اسلامی یعنی غیر انسانی طریق پر سیاست و حکومت کی بنیادیں قائم کرنا شروع کیں۔ اس قسم کی حیوانی ریاستوں کی تاریخ اور ان کے وجود میں آنے کے اسباب بلاشبہ وہی ہیں جو یورپ کے فلاسفہ ذکر کرتے ہیں۔

خیر و شر اس عالم میں پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ اسی لیے ریاست کے تصور کے دو سلسلے ابتدا، آفرینشِ انسان سے لے کر آج تک جاری رہے ہیں۔ ایک تو ریاست کا اسلامی تصور اور دوسرا غیر اسلامی تصور۔ ایک خدائی حکومت کا تصور دوسرا حیوانی حکومت کا تصور۔ ایک خالص اصولی ریاست کا تخیل دوسرا جذبات، اور ہوا، و ہوس کی ریاست کا تخیل۔ کل انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم اسی حکومت الٰہی کی تعلیم و تبلیغ کے لیے تشریف لائے۔ لیکن اس کا واضح تفصیلی اور مکمل ترین خاکہ محض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بنی نوع انسان کے سامنے علمی و عملی صورت میں پیش کیا گیا اور کسی نبی نے اسکی اتنی واضح اور مکمل شکل کبھی نہیں پیش کی تھی۔

الحاصل اسلامی اور غیر اسلامی ریاستوں کا اختلاف محض اصول اور خاکہ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ انکی روحیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متبائن ہیں۔ اسلامی ریاست کی روح عبدیت اور اتباع امرالہٰی ہے اور غیر اسلامی ریاست کی روح طغیان اور اتباع ہوا۔ پھر ظاہر ہے کہ جس ریاست کی بنیاد کسی عقلی اصول اور اخلاقی ضابطہ پر قائم ہو بلکہ محض خواہشاتِ نفس پر، خواہ ان خواہشات کا محرک جذبۂ حُبِ جاہ و اقتدار ہو یا خوف و ہراس، بہرحال اس میں شرکت کرنے والوں کو کبھی راحت و فلاح میسر نہیں ہو سکتی اور نہ وہ کبھی مطمئن رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ اور موجودہ دور کے واقعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر سیاسی نظریے آجتک دنیا کے سامنے آئے وہ سب تجربے سے غلط اور نقصان رساں ہی ثابت ہوئے اور ان نظریوں کو قبول کرنے والے بہت جلد خود ان سے متنفر ہو گئے حتی کہ جس طرح پہلے وہ انکے محاسن کی تبلیغ کرتے تھے اس سے زیادہ انکے معائب کی تبلیغ میں کوشاں ہوئے۔

اس بیان سے یہ ثابت ہو گیا ہو گا کہ اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست کا تصادم کوئی نیا تصادم نہیں ہے بلکہ ابتدا آفرینشِ انسان سے کچھ ہی عرصہ کے بعد سے یہ تصادم شروع ہو گیا تھا اور آج تک جاری ہے۔ اسلیے اسوقت سے لیکر اب تک غیر اسلامی ریاست کے جتنے تخیلات پیش کیے گئے ہیں سب ہماری تنقید کے ذیل میں داخل ہیں۔ خواہ وہ ہندوؤں کے ویدوں والی ریاستیں ہوں یا افلاطون کی مثالی ریاست (Ideal state) یا موجودہ دور کی نازی و جمہوری ریاستیں۔ لیکن دورِ گذشتہ کے تصورات پر تنقید کرنا اسوقت بیسود ہے اسلیے ہم صرف موجودہ دور کے سیاسی افکار کے معائب کو واضح کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

موجودہ دور کے سیاسی نظریات کی تقسیم دو اعتبارات سے کی جا سکتی ہے۔

(۱) فرمانروا اور یا مقتدرِ اعلیٰ کی تعیین کے اعتبار سے۔

(۲) معاشی اعتبار سے۔

اعتبار اول کی بنا پر دو نظریے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ آمریت اور جمہوریت دونوں میں فرق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آمریت میں فرمانروا ارادۂ انفرادی (Individual will) ہوتا ہے اور جمہوریت میں ارادۂ اجتماعی (General will)۔ لیکن حق یہ ہے کہ دونوں میں جہاں تک اصول کا تعلق ہے کوئی فرق نہیں ہے۔ عملی صورت میں ضرور کچھ فرق پیدا ہوتا ہے۔ مگر وہ بھی بعض اوقات۔ آمریت میں بھی اجتماعی ارادہ ہی درحقیقت فرمانروا ہوتا ہے جو ایک ڈکٹیٹر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور جمہوریت میں یہی اجتماعی ارادہ اکثریت رکھنے والی پارٹی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جمہوریت بھی درحقیقت جماعتی آمریت (Party-dictatorship) کا نام ہے۔

معاشی اعتبار سے دو قسم کی ریاستیں ہمارے سامنے ہیں، سرمایہ دار ریاست اور اشتراکی ریاست۔ دونوں میں فرق ظاہر ہے۔ اول الذکر میں سرمایہ رکھنے والا طبقہ حکمراں ہوتا ہے اور ثانی الذکر میں مزدور طبقہ فرمانروا ہوتا ہے۔ آئندہ سطور میں ہم ان سب پر علحدہ علحدہ نظر ڈالینگے۔

(باقی)

زندگی بعدِ موت

[یہ تقریر ۱۰ر جون ۱۹۴۱ء کو نشرگاہ لاہور سے نشر کی گئی تھی اور آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے یہاں نقل کی جاتی ہے]

موت کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے یا نہیں ؟ اور ہے تو کیسی ہے؟ یہ سوال حقیقت میں ہمارے علم کی رسائی سے دور ہے۔ ہمارے پاس وہ آنکھیں نہیں ہیں جن سے ہم موت کی سرحد کے اُس پار جھانک کر دیکھ سکیں کہ وہاں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ہمارے پاس وہ کان نہیں جن سے ہم اُدھر کی کوئی آواز سن سکیں۔ ہم کوئی ایسا آلہ بھی نہیں رکھتے جس کے ذریعہ سے تحقیق کے ساتھ معلوم کیا جاسکے کہ اُدھر کچھ ہے یا کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں تک سائنس کا تعلق ہے، یہ سوال اُسکے دائرے سے قطعی خارج ہے۔ جو شخص سائنس کا نام لیکر کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے، وہ بالکل ایک غیر سائنٹفک بات کہتا ہے۔ سائنس کی رو سے نہ تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی زندگی ہے، اور نہ یہ کہ کوئی زندگی نہیں ہے جب تک ہم کوئی یقینی ذریعۂ علم نہیں پاتے کم از کم اس وقت تک تو صحیح سائنٹفک رویہ یہی ہوسکتا ہے کہ ہم زندگی بعد موت کا نہ انکار کریں نہ اقرار۔

مگر کیا عملی زندگی میں ہم اس سائنٹفک رویہ کو نباہ سکتے ہیں؟ شائد نہیں — بلکہ یقیناً نہیں۔ عقلی حیثیت سے تو یہ ممکن ہے کہ جب ایک چیز کو جاننے کے ذرائع ہمارے پاس نہ ہوں تو اسکے متعلق ہم نفی اور اثبات دونوں سے پرہیز کریں۔ لیکن جب اسی چیز کا تعلق ہماری عملی زندگی سے ہو تو ہمارے لیے اِسکے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ یا تو انکار پر اپنا طرزِ عمل قائم کریں یا اقرار پر۔ مثلاً ایک شخص ہے جس سے آپ واقف نہیں ہیں۔ اگر اُسکے ساتھ آپ کا کوئی معاملہ درپیش نہ ہو تب تو آپکے لیے یہ ممکن ہے کہ اسکے ایماندار ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کوئی حکم نہ لگائیں۔ لیکن جب آپکو اس سے معاملہ کرنا ہو تو

آپ مجبور ہیں کہ یا تو اسے ایماندار سمجھ کر معاملہ کریں یا بے ایمان سمجھ کر۔ اپنے ذہن میں آپ ضرور یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جب تک اسکا ایماندار رہونا یا نہ ہونا ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک ہم شک کے ساتھ معاملہ کرینگے۔ مگر اسکی ایمانداری کو مشکوک سمجھتے ہوئے جو معاملہ آپ کرینگے عملاً اسکی صورت وہی تو ہوگی جو اسکی ایمانداری کا انکار کرنے کی صورت میں ہو سکتی تھی۔ لہذا فی الواقع انکار اور اقرار کے درمیان شک کی حالت صرف ذہن ہی میں ہو سکتی ہے۔ عملی رویہ کبھی شک پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے تو اقرار یا انکار بہر حال ناگزیر ہے۔

یہ بات تھوڑے غور و فکر ہی سے آپکی سمجھ میں آسکتی ہے کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک فلسفیانہ سوال نہیں ہے بلکہ ہماری عملی زندگی سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ دراصل ہمارے اخلاقی رویہ کا سارا انحصار ہی اسی سوال پر ہے۔ اگر میرا یہ خیال ہو کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیوی زندگی ہے اور اسکے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے تو میرا اخلاقی رویہ ایک طرح کا ہوگا۔ اور اگر میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ اسکے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے جس میں مجھے اپنی موجودہ زندگی کے کارنامے کا حساب دینا ہوگا اور وہاں میرا اچھا یا برا انجام میرے یہاں کے اعمال پر منحصر ہوگا تو یقیناً میرا اخلاقی طرز عمل بالکل ایک دوسری ہی طرح کا ہوگا۔ اسکی مثال یوں سمجھیے جیسے ایک شخص یہ سمجھتے ہوئے سفر کر رہا ہے کہ اسے بس یہاں سے بمبئی تک جانا ہے اور بمبئی پہنچ کر نہ صرف یہ کہ اس کا سفر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیگا بلکہ وہاں وہ پولیس اور عدالت اور ہر اس طاقت کی دسترس سے باہر ہوگا جو اس سے کسی قسم کی باز پرس کر سکتی ہو۔ برعکس اسکے ایک دوسرا شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہاں سے بمبئی تک تو اسکے سفر کی صرف ایک ہی منزل ہے، اسکے بعد اسے سمندر پار ایک ایسے ملک میں جانا ہوگا جہاں کا بادشاہ وہی ہے جو ہندوستان کا بادشاہ ہے، اور اس بادشاہ کے دفتر میں میرے اُس پورے کارنامہ کا خفیہ ریکارڈ موجود ہے جو میں نے ہندوستان میں انجام دیا ہے، اور وہاں میرے ریکارڈ کو جانچ کر فیصلہ کیا جائیگا کہ میں اپنے کام کے

لحاظ سے کس درجہ کا مستحق ہوں - آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں شخصوں کا طرزِ عمل کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہوگا - پہلا شخص صرف یہاں سے بمبئی تک کے سفر کی تیاری کریگا، اور دوسرے کی تیاری بعد کی طویل منزلوں کے لیے بھی ہوگی - پہلا شخص یہ سمجھے گا کہ نفع یا نقصان جو کچھ بھی ہے بمبئی پہنچنے تک ہے، آگے کچھ نہیں - اور دوسرا یہ خیال کریگا کہ اصل نفع و نقصان سفر کے پہلے مرحلہ میں نہیں ہے بلکہ آخری مرحلہ میں ہے - پہلا شخص اپنے افعال کے صرف انہی نتائج پر نظر رکھے گا جو بمبئی تک کے سفر میں نکل سکتے ہیں - لیکن دوسرے شخص کی نگاہ اُن نتائج پر ہوگی جو سمندر پار، دوسرے ملک میں پہنچ کر نکلینگے - ظاہر ہے کہ اِن دونوں شخصوں کے طرزِ عمل کا یہ فرق براہ راست نتیجہ ہے انکی اس رائے کا جو وہ اپنے سفر کی نوعیت کے متعلق رکھتے ہیں - ٹھیک اسی طرح ہماری اخلاقی زندگی میں بھی وہ عقیدہ فیصلہ کن اثر رکھتا ہے جو ہم زندگی بعد موت کے بارے میں رکھتے ہیں - عمل کے میدان میں جو قدم بھی ہم اٹھائینگے اسکی سمت کا تعین اس بات پر منحصر ہوگا کہ آیا ہم اسی زندگی کو پہلی اور آخری زندگی سمجھ کر کام کر رہے ہیں، یا کسی بعد کی زندگی اور اسکے نتائج کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں - پہلی صورت میں ہمارا قدم ایک سمت میں اٹھیگا اور دوسری صورت میں اسکی سمت بالکل مختلف ہوگی -

اس سے معلوم ہوا کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک عقلی اور فلسفیانہ سوال نہیں ہے بلکہ عملی زندگی کا سوال ہے - اور جب بات یہ ہے تو ہمارے لیے اس معاملہ میں شک اور تردد کے مقام پر ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں - شک کے ساتھ جو رویہ ہم زندگی میں اختیار کرینگے وہ بھی لامحالہ انکار ہی کے رویہ جیسا ہوگا - لہذا ہم بہرحال اس امر کا تعین کرنے پر مجبور ہیں کہ آیا موت کے بعد کوئی اور زندگی ہے یا نہیں - اگر سائنس اس کے تعین میں ہماری مدد نہیں کرتا تو ہمیں عقلی استدلال سے مدد لینی چاہیے -

اچھا تو عقلی استدلال کے لیے ہمارے پاس کیا مواد ہے؟ ہمارے سامنے ایک تو خود انسان ہے، اور دوسرے یہ نظام کائنات - ہم انسان کو اس نظام کائنات کے اندر رکھ کر دیکھینگے کہ جو کچھ انسان میں

ہے آیا اسکے سارے مقتضیات اس نظام میں پورے ہو جاتے ہیں یا کوئی چیز ایسی بھی رہ جاتی ہے جس کے لیے کسی دوسری نوعیت کے نظام کی ضرورت ہو۔

دیکھیے، انسان ایک تو جسم رکھتا ہے جو بہت سے معدنیات، نمکیات پانی اور گیسوں کا مجموعہ ہے اسکے جواب میں کائنات کے اندر بھی مٹی، پتھر، دھاتیں، نمک، گیس، ہوا، اور اسی جنس کی دوسری چیزیں موجود ہیں۔ ان چیزوں کو کام کرنے کے لیے جتنے قوانین کی ضرورت ہے وہ سب اس کائنات کے اندر کارفرما ہیں اور جس طرح وہ باہر کی فضا میں پہاڑوں، دریاؤں، اور ہواؤں کو اپنے حصہ کا کام پورا کرنیکا موقع دے رہے ہیں اسی طرح انسانی جسم کو بھی ان قوانین کے تحت کام کرنیکا موقع حاصل ہے۔

پھر انسان ایک ایسا وجود ہے جو گرد و پیش کی چیزوں سے غذا لے کر بڑھتا اور نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ اسی جنس کے درخت، پودے، اور گھاس پھونس کائنات میں بھی موجود ہیں، اور وہ قوانین بھی یہاں پائے جاتے ہیں جو نشو و نما پانے والے اجسام کے لیے درکار ہیں۔

پھر انسان ایک زندہ وجود ہے جو اپنے ارادہ سے حرکت کرتا ہے، اپنی غذا خود اپنی کوشش سے فراہم کرتا ہے، اپنے نفس کی آپ حفاظت کرتا ہے، اور اپنی نوع کو باقی رکھنے کا انتظام کرتا ہے۔ کائنات میں اس جنس کی بھی دوسری بہت سی قسمیں موجود ہیں۔ خشکی، تری اور ہوا میں بیشمار حیوانات پائے جاتے ہیں۔ اور وہ قوانین بھی بتمام و کمال یہاں کارفرما ہیں جو ان زندہ ہستیوں کے پورے دائرۂ عمل پر حاوی ہونے کے لیے کافی ہیں۔

ان سب سے اوپر انسان ایک اور نوعیت کا وجود بھی رکھتا ہے جسکو ہم اخلاقی وجود کہتے ہیں۔ اسکے اندر نیکی اور بدی کا شعور ہے، نیک اور بد کی تمیز ہے، نیکی اور بدی کرنے کی قوت ہے، اور اسکی فطرت یہ مطالبہ کرتی ہے کہ نیکی کا اچھا اور بدی کا برا نتیجہ ظاہر ہو۔ وہ ظلم اور انصاف، سچائی اور جھوٹ، حق اور ناحق، رحم اور بے رحمی، احسان اور احسان فراموشی، فیاضی اور بخل، امانت اور خیانت،

اور ایسی ہی مختلف اخلاقی صفات کے درمیان فرق کرتا ہے - یہ صفات عملاً اسکی زندگی میں پائی جاتی ہیں اور یہ محض خیالی چیزیں نہیں ہیں بلکہ بالفعل ان کے اثرات انسانی تمدن پر مترتب ہوتے ہیں - لہذا انسان جس فطرت پر پیدا ہوا ہے اس کا شدت کے ساتھ یہ تقاضا ہے کہ جس طرح اسکے افعال کے طبعی نتائج رونما ہوتے ہیں اُسی طرح اخلاقی نتائج بھی رونما ہوں -

مگر نظام کائنات پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھیے کیا اس نظام میں انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح رونما ہو سکتے ہیں؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں اسکا امکان نہیں ہے - اس لیے کہ یہاں اس کا انتظام ہی نہیں کیا گیا ہے - انسان کے سوا یہاں، کم از کم ہمارے علم کی حد تک، کوئی دوسری ایسی مخلوق نہیں پائی جاتی جو اخلاقی وجود رکھتی ہو - سارا نظام کائنات طبعی قوانین کے تحت چل رہا ہے، اخلاقی قوانین کسی طرف کارفرما نظر نہیں آتے - یہاں روپے میں وزن اور قیمت ہے مگر سچائی میں نہ وزن ہے نہ قیمت - یہاں آم کی گٹھلی سے ہمیشہ آم پیدا ہوتا ہے، مگر حق پرستی کا بیج بونے والے پر کبھی پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور کبھی، بلکہ اکثر جوتیوں کی - یہاں مادّی عناصر کے لیے مقرر قوانین ہیں جنکے مطابق ہمیشہ مقرر نتائج نکلتے ہیں مگر اخلاقی عناصر کے لیے کوئی مقرر قانون نہیں ہے کہ انکی فعلیت سے ہمیشہ مقرر نتیجہ نکل سکے - طبعی قوانین کی فرمانروائی کے سبب سے اخلاقی نتائج کبھی تو نکل ہی نہیں سکتے، کبھی نکلتے ہیں تو صرف اُس حد تک جسکی اجازت طبعی قوانین دیدیں، اور بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ اخلاق ایک فعل سے ایک خاص نتیجہ نکلنے کا تقاضہ کرتا ہے مگر طبعی قوانین کی مداخلت سے نتیجہ بالکل برعکس نکل آتا ہے انسان نے خود اپنے تمدنی و سیاسی نظام کے ذریعہ سے تھوڑی سی کوشش اس امر کی کی ہے کہ انسانی اعمال کے اخلاقی نتائج ایک مقرر ضابطہ کے مطابق برآمد ہو سکیں مگر یہ کوشش بہت محدود پیمانہ پر ہے اور بے حد ناقص ہے - ایک طرف طبعی قوانین اسکو محدود اور ناقص بناتے ہیں اور دوسری طرف انسان کی اپنی بہت سی کمزوریاں اس انتظام کے نقائص میں اور زیادہ اضافہ کرتی ہیں -

میں اپنے مدعا کی توضیح چند مثالوں سے کرونگا۔ دیکھیے! ایک شخص اگر کسی دوسرے شخص کا دشمن ہو اور اسکے گھر میں آگ لگا دے تو اسکا گھر جل جائیگا۔ یہ اسکے فعل کا طبعی نتیجہ ہے۔ اس کا اخلاقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس شخص کو اتنی ہی سزا ملے جتنا اس نے ایک خاندان کو نقصان پہنچایا ہے۔ مگر اس نتیجہ کا ظاہر ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ آگ لگانے والے کا سراغ ملے، وہ پولیس کے ہاتھ آسکے، اس پر جرم ثابت ہو، عدالت پوری طرح اندازہ کرسکے کہ آگ لگنے سے اس خاندان کو اور اسکی آئندہ نسلوں کو ٹھیک کتنا نقصان پہنچا ہے، اور پھر انصاف کے ساتھ اس مجرم کو اتنی ہی سزا دے۔ اگر ان شرطوں میں سے کوئی شرط بھی پوری نہ ہو تو اخلاقی نتیجہ یا تو بالکل ہی ظاہر نہ ہوگا یا اس کا صرف ایک تھوڑا سا حصہ ظاہر ہو کر رہ جائیگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے حریف کو برباد کرکے وہ شخص دنیا میں مزے سے پھولتا پھلتا رہے۔

اس سے بڑے پیمانے پر ایک اور مثال لیجیے۔ چند اشخاص اپنی قوم میں اثر پیدا کر لیتے ہیں اور ساری قوم ان کے کہے پر چلنے لگتی ہے۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر وہ لوگوں میں قوم پرستی کا اشتعال اور ملک گیری کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، گرد و پیش کی قوموں سے جنگ چھیڑ دیتے ہیں، لاکھوں آدمیوں کو ہلاک کرتے ہیں، ملک کے ملک تباہ کر ڈالتے ہیں، کروڑوں انسانوں کو ذلیل اور پست زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں، اور انسانی تاریخ پر اُنکی کارروائیوں کا ایسا زبردست اثر پڑتا ہے جس کا سلسلہ آئندہ سینکڑوں برس تک پُشت در پُشت اور نسل در نسل پھیلتا چلا جائیگا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ چند اشخاص جس جرم عظیم کے مرتکب ہوئے ہیں اس کی مناسب اور منصفانہ سزا ان کو کبھی اس دنیوی زندگی میں مل سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر ان کی بوٹیاں بھی نوچ ڈالی جائیں، اگر ان کو زندہ جلا ڈالا جائے یا کوئی اور ایسی سزا دی جائے جو انسان کے بس میں ہے، تب بھی کسی طرح وہ اس نقصان کے برابر سزا نہیں پا سکتے جو انہوں نے کروڑہا انسانوں کو اور انکی آئندہ بے شمار نسلوں کو پہنچایا ہے۔ موجودہ نظام

کائنات جن طبعی قوانین پر چل رہا ہے انکے تحت کسی طرح یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے جرم کے برابر سزا پا سکیں۔

اسی طرح اُن نیک انسانوں کو لیجیے جنہوں نے نوع انسانی کو حق اور راستی کی تعلیم دی اور ہدایت کی روشنی دکھائی اور جنکے فیض سے بیشمار انسانی نسلیں صدیوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں اور نہ معلوم آئندہ کتنی صدیوں تک اٹھاتی چلی جائینگی - کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کی خدمات کا پورا صلہ انکو اس دنیا میں مل سکے؟ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ موجودہ طبعی قوانین کی حدود کے اندر ایک شخص اپنے اُس عمل کا پورا صلہ حاصل کر سکتا ہے جس کا ردِ عمل اسکے مرنے کے بعد ہزاروں برس تک اور بے شمار انسانوں تک پھیل گیا ہو؟

جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں، اول تو موجودہ نظام کائنات جن قوانین قدرت پر چل رہا ہے انکے اندر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مترتب ہو سکیں، دوسرے یہاں چند سال کی زندگی میں انسان جو عمل کرتا ہے اس کے ردِ عمل کا سلسلہ اتنا وسیع ہوتا ہے اور اتنی مدت تک جاری رہتا ہے کہ صرف اسی کے پورے نتائج وصول کرنے کے لیے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس کی زندگی درکار ہے اور موجودہ قوانین قدرت کے ماتحت انسان کو اتنی زندگی ملنی ناممکن ہے - اس سے معلوم ہوا کہ انسانی ہستی کے خاکی، عضوی اور حیوانی عناصر کے لیے تو موجودہ طبعی دنیا (Physical world) اور اسکے طبعی قوانین کافی ہیں، مگر اس کے اخلاقی عنصر کے لیے یہ دنیا بالکل ناکافی ہے - اس کے لیے ایک دوسرا نظام عالم درکار ہے جس میں حکمراں قانون (Governing Law) اخلاق کا قانون ہو، اور طبعی قوانین اس کے ماتحت محض مددگار کی حیثیت سے کام کریں - جس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ غیر محدود ہو - جس میں وہ تمام اخلاقی نتائج جو یہاں مترتب ہونے سے رہ گئے ہیں یا اُلٹے مترتب ہوئے ہیں، اپنی صحیح صورت میں پوری طرح مترتب ہو سکیں - جہاں سونے اور چاندی کے بجائے

نیکی اور صداقت میں وزن اور قیمت ہو۔ جہاں آگ صرف اُس چیز کو جلائے جو اخلاقاً جلنے کی مستحق ہو، جہاں عیش اس کو ملے جو نیک ہو اور مصیبت اسکے حصہ میں آئے جو بد ہو۔ عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے کہ ایسا ایک نظام عالم ضرور ہونا چاہیے۔

جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے، وہ ہم کو صرف "ہونا چاہیے" کی حد تک لیجا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا واقع میں ایسا کوئی عالم ہے بھی، تو ہماری عقل اور ہمارا علم دونوں اس کا حکم لگانے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور تمہاری فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے فی الواقع وہ ہونے والی ہے اور اسی طرح ہونے والی ہے موجودہ نظام عالم جو طبعی قوانین پر بنا ہے، ایک وقت میں توڑ ڈالا جائیگا۔ اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ پر ہونگی۔ پھر اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے تھے، دوبارہ پیدا کریگا اور بیک وقت ان سب کو اپنے سامنے جمع کریگا۔ وہاں ایک ایک شخص کا، ایک ایک قوم کا، اور پوری انسانیت کا ریکارڈ ہر غلطی اور ہر فروگذاشت کے بغیر محفوظ ہوگا۔ ہر شخص کے ایک ایک عمل کا جتنا ردِ عمل دنیا میں ہوا ہے اسکی پوری روداد موجود ہوگی۔ وہ تمام نسلیں گواہوں کے کٹہرے میں حاضر ہونگی جو اس ردِ عمل سے متاثر ہوئیں۔ ایک ایک ذرہ جس پر انسان کے اقوال اور افعال کے نقوش ثبت ہوئے، اپنی داستان سنائیگا۔ خود انسان کے ہاتھ اور پاؤں اور آنکھ اور زبان اور تمام اعضاء شہادت دینگے کہ ان سے اس نے کس طرح کام لیا۔ پھر اس روداد پر وہ سب سے بڑا حاکم پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کریگا کہ کون کتنے انعام کا مستحق ہے اور کون کتنی سزا کا۔ یہ انعام اور یہ سزا دونوں چیزیں اتنے بڑے پیمانے پر ہونگی جس کا کوئی اندازہ موجودہ نظام عالم کی محدود مقداروں کے لحاظ سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں وقت اور جگہ کے معیار کچھ اور ہونگے، وہاں کی مقداریں کچھ

اور ہونگی، وہاں کے قوانین قدرت کسی اور قسم کے ہونگے۔ انسان کی جن نیکیوں کے اثرات دنیا میں ہزاروں برس پھیلتے رہے ہیں وہاں وہ ان کا بھرپور صلہ وصول کرسکیگا بغیر اسکے کہ موت اور بیماری اور بڑھاپا اسکے عیش کا سلسلہ توڑ سکیں۔ اور اسی طرح انسان کی جن برائیوں کے اثرات دنیا میں ہزارہا برس تک اور بیشمار انسانوں تک پھیلتے رہے ہیں، وہاں وہ انکی پوری سزا بھگتے گا بغیر اسکے کہ موت اور بیہوشی آکر اسے تکلیف سے بچا سکے۔

ایسی ایک زندگی اور ایسے ایک عالم کو جو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں، مجھے انکے ذہن کی تنگی پر ترس آتا ہے۔ اگر ہمارے موجودہ نظام عالم کا موجودہ قوانین قدرت کے ساتھ موجود ناممکن ہے تو آخر ایک دوسرے نظام عالم کا دوسرے قوانین کے ساتھ وجود میں آنا کیوں ناممکن ہو؟ البتہ یہ بات کہ واقع میں ایسا ضرور ہوگا، تو اس کا تعین نہ دلیل سے ہوسکتا ہے اور نہ علمی ثبوت سے۔ اسکے لیے ایمان بالغیب کی ضرورت ہے۔

مطبوعات

دین و دانش تالیف مولانا سید محمود علی صاحب سابق پروفیسر رندھیر کالج کپورتھلہ - ضخامت ۵۰۰ صفحہ قیمت مجلد ۸؎ غیر مجلد ۲؎ - کتب خانہ انصاریہ جالندھر -

یہ جدید علم کلام کی ایک اچھی کتاب ہے - اس میں موجودہ زمانہ کے فلسفہ و سائنس سے متأثر لوگوں کو دین اور اسکے اعتقادی مسائل سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے ، اور عام اہلِ کلام کی طرح فاضل مصنف نے تفہیم کی سعی میں ایسی کھینچ تان نہیں کی ہے جس سے نفس معتقداتِ دینی ہی کی شکل بگڑ جائے - ہستئ باری ، وحی ، نبوت ، ملائکہ ، معجزات ، ختم نبوت ، جبر و قدر ، جزا و سزا اور حشر و نشر وغیرہ پر مفصل کلام کرتے ہوئے انہوں نے ہر چیز کو معقول دلائل سے سمجھایا ہے ، اور ملحد فلاسفہ و حکماء کے ساتھ ہندو فلسفہ اور مسیحی فلسفہ کی بھی اچھی طرح تردید کی ہے - لیکن یہ طبعی امر ہے کہ معتقداتِ دینی پر معقولی رنگ میں گفتگو کرتے ہوئے محتاط سے محتاط آدمی کو بھی بسا اوقات ٹھوکر لگ جاتی ہے - جہاں ٹھیٹھ حقیقت کو محدود عقلوں کی رسائی تک لانے میں استدلال کے کمزور سہارے ناکافی ہو جاتے ہیں وہاں ایک صحیح العقیدہ متکلم بر سبیل تنزّل ایسی باتیں مجبوراً کہہ جاتا ہے جو بجائے خود حقیقت سے بعید ہوتی ہیں - فاضل مصنف کو بھی بعض مقامات پر یہ مشکل پیش آئی ہے - مثلاً مذہب کے ارتقاء کا جو تصور انہوں نے پیش کیا ہے وہ قرآن کے بیان سے بہت ہٹا ہوا ہے اور اسی غلطی کے نتیجہ میں نسخ شرائع کی توجیہ بھی انہوں نے ایسی کی ہے جو قرآن کے خلاف ہے قرآن کی رو سے دین ہرگز ایک ارتقائی چیز نہیں ہے ، اور ظاہر ہے کہ حقیقت کا براہِ راست علم جب وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو تو اس میں ارتقاء کبھی نہیں ہو سکتا - ارتقاء اگر ہو سکتا ہے تو انسان کے اپنے مذہبی تجسس اور اسکے نتائج میں ہو سکتا ہے - مگر مذہب کا جو علم اللہ تعالیٰ خود انبیاء کو عطا کرے اسکو ارتقاء سے کیا تعلق - وہ کوئی

تدریج دریافت ہونے والی چیز تھوڑی ہے کہ تجربات و مشاہدات کی ترقی کے ساتھ ساتھ علم میں اضافہ ہو۔ وہ تو امر واقعی کا کشفی علم ہے جسکی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے آنکھوں سے ہم کسی چیز کو دیکھ لیں۔ اس قسم کا علم جس زمانے میں جسکو حاصل ہو وہ بعینہٖ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کسی بعد کے زمانہ میں کسی دوسرے کو حاصل ہو۔ اسی لیے نسخ شرائع کی بھی وہ توجیہ صحیح نہیں ہے جو مصنف نے کی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے علوم اور انکی معلومات میں کوئی تفاوت قرآن سے معلوم نہیں ہوتا۔ تمام انبیاء پر ایک ہی علم حق کا فیضان ہوا تھا اور امر حق کے علم میں ان کے درمیان اس حیثیت سے کوئی فرق نہ تھا کہ کسی کا علم کسی کے مقابلہ میں ناقص ہو۔ فرق اگر رہا ہے تو وہ ان احکام میں تھا جو مختلف زمانوں اور مختلف قوموں کے حالات اور انکی مخصوص ضروریات کے لحاظ سے دیے گئے تھے۔ اور ان کے بھی اصول میں فرق نہ تھا بلکہ صرف تفصیلی اشکال میں تھا۔

شیطان اور جن کی حقیقت کے متعلق بھی فاضل موصوف نے جو کچھ لکھا ہے وہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔ ان کے بیان سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ شیاطین اور ملائکہ میں محض نوع کا فرق ہے، جنس ایک ہے، حالانکہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بالکل مختلف جنس کی ہستیاں ہیں۔ ملائکہ قطعی غیر مختار ہیں۔ بخلاف اسکے جن تقریباً انسان کی طرح ذی اختیار ہیں، اُن میں سے جو اللہ کی نافرمانی اختیار کریں ان کا نام شیاطین ہے، اور جو فرمانبرداری اختیار کریں وہ مومن جن ہیں۔

اس قسم کی چند لغزشوں کے باوجود کتاب فی الجملہ بہت مفید ہے اور جو لوگ اسلام کے عقائد کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

دین و آئین | تالیف مولانا سید محمود علی صاحب۔ ضخامت ۲۵۲ صفحات۔ قیمت مجلد عہ۔ غیر مجلد ...۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ انصاریہ، جالندھر۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے اسلام کے ان قوانین کی تشریح کی ہے جن پر آج کل عموماً غیر مسلموں کی طرف سے اعتراضات کیے جاتے ہیں، اور جن میں ترمیم و تغیر کرنے کے لیے دین سے ناواقف اور دنیا کے

فریفتہ مسلمان بے چین نظر آتے ہیں۔ ابتدا میں انہوں نے نہایت لطیف پیرایہ میں ان لوگوں کے خیال کی تردید کی ہے جو چاہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں دنیا جن جن راہوں پر چل رہی ہے اسلام بھی اسکے پیچھے پیچھے انہی راہوں پر چلتا رہے اور تمام ان غلط کاریوں کے لیے جواز کا فتویٰ دیتا چلا جائے جو نفس کے مبدے اور خواہشات کے غلام اختیار کرتے جائیں۔ اسکے بعد انہوں نے نماز، روزہ اور مناسک حج کے متعلق مخالفین کے اعتراضات اور مذبذبین کے بہانوں کا جواب دیتے ہوئے ان عبادات کی روح اور ان کے مصالح و فوائد بیان کیے ہیں۔ پھر سود، تعدد ازدواج، طلاق و خلع، پردہ، قانون دیوانی، قانون وراثت، قانون فوجداری اور قتل مرتد وغیرہ مسائل پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور اسلامی احکام کی حمایت کا حق ادا کر دیا ہے۔

کتاب میں بعض مقامات ایسے نظر آئے جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ فاضل مصنف ان پر نظر ثانی فرمائیں۔ مثلاً اختلاف مراتب نبوت کے بیان میں انکا یہ فرمانا کہ وحی کے ذریعہ سے جو علوم انبیاء علیہم السلام پر القا ہوئے ان میں انبیاء کی ذاتی استعدادوں کے لحاظ سے تفاوت تھا، اور یہ کہ بعض پیغمبروں پر الفاظ کے بغیر صرف خیال نازل ہوا ہے اور الفاظ انہوں نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق خود وضع کیے، اور یہ کہ بعض پیغمبروں پر الفاظ بھی القا ہوئے مگر انکی استعداد ایسی قوی نہ تھی کہ صاف اور صریح کو اخذ کر سکتے، اور یہ کہ خالق کے لیے باپ کا استعارہ اور رسولوں کے لیے اوتار کا لفظ اسی کمی استعداد کے سبب سے بعض انبیاء نے استعمال کیا، یہ سب باتیں نہایت مخدوش ہیں۔ نہ ان کے لیے قرآن میں کوئی بنیاد ملتی ہے اور نہ قیاس عقلی ہی کے لحاظ سے انکو درست کہا جا سکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّآ اَوۡحَیۡنَآ اِلَیۡکَ کَمَآ اَوۡحَیۡنَآ اِلٰی نُوۡحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی کی گئی وہ اس وحی سے مختلف نہ تھی جو نوح علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے نبیوں پر کی گئی تھی۔ رہا قیاس عقلی تو اسکی رو سے ہمارے لیے دو باتوں میں سے کسی ایک کو ماننے بغیر چارہ نہیں، یا تو ہم انسان کو خود اپنی ہدایت کا ذمہ دار سمجھیں اور اس صورت میں نبوت بالکل غیر ضروری ہے، یا ہم اس بات کے قائل ہوں کہ راہ راست بتانا اللہ کا کام ہے اور اس صورت میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے راہ راست بتانے

کا جو کام اپنے ذمہ لیا ہے اسکو انجام دینے میں اسکی طرف سے کوئی کوتاہی ہو۔ ناقص استعدادوں کے انسانوں کو پیغام رسانی کے لیے منتخب کرنا، یا پیغام کی تعبیر کو پیغام رسانوں کے اوپر چھوڑ دینا کہ اپنے ذہن سے جس طرح چاہیں مختلف طور پر اسکو تعبیر کریں، یا کسی کے پاس اپنا پیغام غیر واضح صورت میں اور کسی کے پاس واضح صورت میں بھیجنا، ان میں سے جس بات کے بھی آپ قائل ہوں، اس سے اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت و ہدایت پر حرف آتا ہے، اور ان تمام گمراہیوں کی ذمہ داری اللہ کی طرف عائد ہوتی ہے (معاذ اللہ) جو ناقص ہدایت پانے کی وجہ سے انسانوں میں پیدا ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے پیغمبر بھیجے ہی اس لیے ہیں کہ قیامت میں باز پرس کے موقع پر کوئی یہ حجت پیش نہ کر سکے کہ آپ نے خود ہی ہم کو راستہ نہ بتایا پھر غلط روی کے ذمہ دار ہم کیسے ہو سکتے ہیں (لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ)۔ لیکن اگر امر واقعہ وہی ہو جو فاضل مصنف نے تجویز کیا ہے تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ اللہ نے لوگوں کے لیے حجت پیش کرنے کی اچھی خاصی گنجائش چھوڑ دی ہے۔

سود کے مسئلہ میں فاضل موصوف نے مسلمانوں کی موجودہ مجبوریوں کو پیش نظر رکھ کر انتہائی متقیانہ احتیاط کے ساتھ ایسے قومی بینک کھولنے کے جواز کی صورت نکالی ہے جن میں محض تاجرانہ اغراض کے لیے سودی لین دین کیا جائے۔ اس تمام بحث کو ہم نے پورے غور کے ساتھ پڑھا، کوئی شک نہیں کہ آج کل جو لوگ نہایت بے باکی کے ساتھ سود کی تحلیل کے لیے احکام شرعیہ میں قطع و برید کر رہے ہیں، ان کے مقابلہ میں مولانا محمود علی صاحب کی روش ایک خدا ترس اور ذمہ دار آدمی کی سی روش ہے، اور اس سے بھی انکار نہیں کہ مجبوری و اضطرار کی حالت میں احکام شرعیہ کے اندر وہ تخفیف ہو سکتی ہے جو مولانا نے تجویز فرمائی ہے، مگر بہتر ہوتا کہ اس تجویز کو پیش کرنے کے ساتھ مولانا یہ بھی فرما دیتے کہ مسلمانوں کا کام یہ نہیں ہے کہ اضطرار کی حالت کو برقرار رکھ کر حرام کھاتے اور کھلاتے رہیں بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ دنیا کے اس بگڑے ہوئے نظام کو بدلنے کے لیے جان توڑ جد و جہد کریں جسکی بدولت حرام و حلال کی تمیز مٹ گئی ہے اور جس کے تسلط نے اتنی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ خدا پرست لوگ خدا کی قائم کردہ حدود کی پابندی کر سکیں۔

مفردات القرآن | تالیف مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ۔ ضخامت ۷۲ صفحات۔ قیمت ۱۴ ر۔ دائرۂ حمیدیہ۔ سرائے میر۔ ضلع اعظم گڈھ۔

مولانا مرحوم نے اپنی تفسیر قرآن کے سلسلہ میں قرآن مجید کے بعض اُن الفاظ کی تحقیق کی تھی جن کے مفہوم میں یا تو اختلاف ہو رہا ہے، یا جن کا پورا مفہوم متعین نہیں کیا گیا ہے، یا جنکے معنی کے متعلق غلط فہمیاں عام طور پر شائع ہوگئی ہیں۔ اس تحقیق کو انہوں نے ایک الگ کتاب کی صورت میں مرتب کرنا شروع کر دیا تھا مگر اسے مکمل نہ کر سکے۔ متعدد مقامات پر بحث تشنہ رہ گئی ہے اور بعض جگہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے لکھتے لکھتے بیکایک چھوڑ دیا ہے۔ تاہم جتنا بھی لکھا ہے نہایت مفید ہے اور اس سے قرآن مجید کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کو بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ کتاب عربی زبان میں ہے۔

جمہرۃ البلاغہ | تالیف مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت ۱۲ ر دائرۂ حمیدیہ سرائے میر۔ ضلع اعظم گڈھ۔

قرآن مجید کے معجزہ ہونے پر سب سے پہلی دلیل اسکی بلاغت ہے۔ اگرچہ اعجاز قرآنی کے اور بھی بہت سے پہلو ہیں، اور ہر پہلو اپنی جداگانہ اہمیت رکھتا ہے، لیکن چونکہ پڑھنے والے کو سب سے پہلے نفسِ کلام سے سابقہ پیش آتا ہے، اور دوسرے پہلوؤں کی طرف بعد میں نظر جاتی ہے، اسلیے کلام کی بلاغت باقی تمام پہلوؤں پر مقدم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اسلام نے ابتدا سے قرآن مجید کے وجوہ بلاغت کو نمایاں کرنے کی طرف توجہ کی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ ناگزیر تھا کہ نقد ادبی کے قواعد مدون کیے جاتے، محاسن کلام کا تتبع کیا جاتا اور یہ متعین کیا جاتا کہ کلام کا حسن کن چیزوں میں ہے، اور بیان کی خوبی کا معیار کیا ہے۔ چنانچہ علماء نے یہ کام بھی بہت بڑے پیمانہ پر انجام دیا اور علم البلاغت ایک مستقل فن بن گیا جس پر گذشتہ ایک ہزار سال میں دفتر کے دفتر لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن جس طرح منطق، فلسفہ اور علم الاخلاق وغیرہ میں یونان کے اثر نے مسلمانوں کو تحقیق کی سیدھی راہ سے ہٹا دیا، اسی طرح نقد ادبی میں بھی وہ خصوصیت کے ساتھ

ارسطو سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور مزید برآں عجمی مذاق نے بھی ان پر کافی اثر ڈالا۔ اسیلیے ابتدائی دور کے چند مصنفین کو چھوڑ کر بعد اکثر و بیشتر اہلِ علم نقد ادبی کے اپنی قواعد کی پیروی کرتے چلے گئے جنکی بنا ارسطو نے ڈالی تھی، اور جنکو عجمی تکلفات کے اثر نے اور زیادہ مسخ کر دیا تھا۔ سمجھا یہ جانے لگا کہ کلام کا حسن تشبیہ و استعارہ و مجاز میں ہے اور صنائع و بدائع اسکی زینت ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ علم بلاغت کا ارتقاء صحیح ذوقِ ادب سے بہت کچھ منحرف ہو گیا اور بلاغت قرآنی کے وجوہ نمایاں ہونے کے بجائے اور زیادہ مستور ہوتے چلے گئے۔

مولانا حمید الدین مرحوم کی خدمات میں سے یہ خدمت بھی بڑی قابلِ قدر ہے کہ انہوں نے علم بلاغت کو صدیوں کے یونانی و عجمی اثرات کی گرفت سے نکال کر از سر نو مدوّن کرنے کی بنا ڈالی۔ ان کا زیر نظر رسالہ اگرچہ نہایت مختصر ہے مگر اس میں انکی شانِ تحقیق و اجتہاد کا کمال نظر آتا ہے۔ انہوں نے اگلوں کی دماغی غلامی سے آزاد ہو کر ان بہت سے غلط نظریوں کی تردید کی ہے جو خواہ مخواہ علم بلاغت کے مسلمات میں داخل ہو گئے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ ارسطو کے وضع کردہ اصولوں کی تو انہوں نے بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ بیخکنی کی ہے۔ پھر خود اپنے اجتہاد سے بلاغت کے اصول مرتب کیے ہیں جو ذوق ادب اور ذوق عربیت سے بھی مناسبت رکھتے ہیں اور جن سے کلام اللہ کی ادبی خصوصیات بھی زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھی جا سکتی ہیں۔ ہمارے عربی مدارس میں عموماً فن بلاغت کی تعلیم مختصر المعانی اور مطوّل جیسی کتابوں کے ذریعہ سے دی جاتی ہے جو ایک طرف فن تعلیم کے نقطۂ نظر سے انتہائی ناقص کتابیں ہیں اور دوسری طرف فن بلاغت کے اس دور کی تصنیف ہیں جبکہ یہ فن عجمیت و یونانیت کی آمیزش سے اپنے انحطاط کی آخری حد کو پہنچ چکا تھا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان کتابوں میں طلبہ کا وقت ضائع کرنے کے بجائے مولانا حمید الدین مرحوم کے اس رسالہ کو داخل نصاب کیا جائے۔

یہاں یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ مولانا کے اس رسالہ کو جدید طرز پر اصول بلاغت کی تدوین کی راہ میں آخری چیز نہیں بلکہ ابتدائی چیز سمجھنا چاہیے۔ موجودہ دور میں نقد ادبی کا فن ایک بہت بڑا فن بن چکا ہے

اور ترقی یافتہ زبانوں میں اس پر بہت کام کیا گیا ہے۔ اگر کوئی صاحب ہمت اٹھے تو اس فن کے مطالعہ سے مولانا مرحوم کی قائم کردہ بنیادوں پر بڑی عمارت تعمیر کرسکتا ہے۔

تعلیم القرآن | مولوی محمد عبدالرحیم صاحب۔ دارالاشاعت تعلیم القرآن، قطبی گوڑہ جدید، حیدرآباد دکن۔

صاحب موصوف نے قرآن مجید کی تعلیم کو عام کرنے کے لیے تفسیر قرآن کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو بیس بیس صفحے کے رسالوں کی صورت میں مسلسل شائع ہو رہی ہے۔ اب تک پارۂ عم تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ ہر سورہ کے آغاز میں سورہ کے مضامین کا خلاصہ اور اس کے متعلق ضروری معلومات دینے کے بعد تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ دو دو چار چار آیتیں نقل کر کے پہلے ان کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ دیا ہے، پھر آیات کا مربوط ترجمہ ہے، پھر لغات کی تشریح ہے اور آخر میں تفسیر ہے۔ تفسیر قابلِ اطمینان ہے، صحیح عقائد کے مطابق ہے، اور عامۃ الناس کو قرآن کے مطالب سے جس قدر آشنا ہونا چاہیے اُسکے لیے کافی ہے۔ ہر رسالہ کی قیمت ۲ اور محصول ڈاک ۲ پائی ہے۔ ایک جلد کی قیمت (جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی) چار روپیہ مع محصول ڈاک رکھی گئی ہے۔

تدوین حدیث | مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی۔ ضخامت ۱۰۶ صفحات۔

حدیث کے متعلق آج کل علم کی کمی اور اجتہاد کی جرأتِ بیجا کے سبب سے جو شبہات بکثرت پھیل گئے ہیں، انکی تردید میں بہت سے اہل علم حضرات نے مفید مضامین لکھے ہیں، مگر ہماری نظر میں مولانا مناظر احسن صاحب کے اس خطبہ سے زیادہ جامع، تشفی بخش اور فوائد سے لبریز کوئی چیز ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ یہ خطبہ حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے توسیعی خطبات کے سلسلہ میں پڑھا گیا تھا اور وہیں کے مجموعۂ تحقیقاتِ علمیہ میں شائع ہوا ہے۔ جو لوگ حدیث کے بارے میں اپنے شکوک کو واقعی رفع کرنا چاہتے ہیں، یا حقیقت امر سے آگاہ ہونے کے خواہشمند ہیں انکو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ افسوس ہے کہ کتاب پر نہ تو قیمت لکھی گئی ہے اور نہ یہی لکھا ہے کہ کوئی منگانا چاہے تو کہاں سے منگائے۔ بہتر ہو کہ مولانا

ممدوح اسکی کثرت اشاعت کیلیے کوئی تدبیر فرمائیں -

النبی الخاتم | تالیف مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی - ضخامت ۲۱۰ صفحات - قیمت مجلد ۱۲؍ مکتبہ الفرقان ، بریلی -

سیرۃ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوٹی بڑی کتابیں تو بے شمار ہی لکھی گئی ہیں ، مگر یہ مختصر سی کتاب اپنے رنگ میں بالکل نرالی ہے - مصنف کا خطیبانہ طرز بیان اور بعض مقامات پر بائیبل کا اسلوب اول اول پڑھنے والے کو ذرا پریشان کر دیتا ہے لیکن جب آدمی ان کے طرز خاص سے ذرا مانوس ہو جاتا ہے تو اس سے بہت فائدہ اٹھا سکتا ہے - اس میں سیرت پاک کے بہت سے اُن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو عموماً سیرت نگاروں کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں ، بہت سی بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے لطیف نکات پیدا کیے گئے ہیں ، اور اسکے صفحات میں جگہ جگہ آدمی کو ایسی معلومات بکھری ہوئی ملتی ہیں جو شائد سیرت کی بڑی بڑی کتابوں میں بھی اسے نہ ملینگی -

اسلام کیسے شروع ہوا ؟ | تالیف جناب عبدالواحد سندھی جامعی - ضخامت ۲۰۸ صفحات قیمت مجلد عہر - مکتبہ جامعہ ، دہلی -

سندھی صاحب کو بچوں کیلیے مذہبی کتابیں لکھنے کا اچھا سلیقہ ہے - اس سے پہلے وہ سیرت پاک اور قرآن کے متعلق دو اچھی کتابیں لکھ چکے ہیں - اب یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ پر انکی کتاب شائع ہوئی ہے - اس میں انہوں نے پہلے مختصراً اسلام کی تعلیم کا خلاصہ بیان کیا ہے ، پھر یہ بتایا ہے کہ اس تعلیم کو لیکر ابتدا سے دنیا میں نبی آتے رہے ، پھر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اسکی تکمیل کا ذکر کیا ہے ، پھر یہ بتایا ہے کہ آخری رسول پاک نے کس طرح مشکلات کا مقابلہ کر کے لوگوں کی اصلاح کی اور ۲۳ سال کی مدت میں سارے ملک عرب کو مسلمان بنا کر چھوڑا - مصنف کی زبان شیریں اور سلیس ہے - انہوں نے خصوصیت کیساتھ نبی صلعم کی مکی زندگی کے واقعات کو بڑے سبق

آموز پیرائے میں بیان کیا ہے جس سے امید ہے کہ بچوں کی ذہنیت پر اچھا اثر پڑیگا۔ مگر افسوس ہے کہ اس کتاب میں کتابت کی غلطیاں مکتبۂ جامعہ کی دوسری کتابوں کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔

تاریخ اسلام (حصہ دوم) | شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی۔ ضخامت ۳۷۴ صفحات۔ قیمت سے/ر دار المصنفین، اعظم گڈھ۔

”تاریخ اسلام“ کے نام سے دار المصنفین نے جو سلسلہ شائع کرنا شروع کیا ہے اس کے پہلے حصہ (مشتمل بر دور خلفاء راشدین) پر ان صفحات میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ زیر نظر کتاب اس کا دوسرا حصہ ہے جس میں بنی امیہ کے دور حکومت کی تاریخ درج کی گئی ہے۔ اسلامی تاریخ کے متعلق ہمارے اور جناب مولف کے نقطۂ نظر میں جو اختلاف ہے اسکو ہم پہلے حصہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں، لہذا یہاں اس کے اعادہ کی حاجت نہیں۔ اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ کتاب تاریخی معلومات کی حیثیت سے اچھی اور مفید ہے۔ اردو زبان میں مسلمانوں کی ایک مستند اور مربوط تاریخ کی جو کمی تھی، امید ہے کہ اس سلسلہ کی تکمیل کے بعد وہ پوری ہو جائیگی۔ بنی امیہ کے لیے بحیثیت مجموعی، اور ان کے ایک ایک فرمانروا کے لیے فرداً فرداً جو وکیلانہ رویہ اس کتاب میں اختیار کیا گیا ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ ہر ایک کی برائیاں اور بھلائیاں جو تاریخ سے ثابت ہیں، جوں کی توں بیان کردی جاتیں، اور جو تہمتیں ان پر ثابت نہیں ہیں انکی تردید کردی جاتی۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ وکیلانہ طرز بیان ایک مورخ کے لیے موزوں نہیں ہے۔

حیات احمد بن حنبل | تالیف مولانا شاہ محمد عز الدین صاحب پھلواروی۔ ضخامت ۶۵ صفحات۔ قیمت ۶/ر۔ مجیبیہ بک ڈپو، پھلواری ضلع پٹنہ۔

امام احمد رحمۃ اللہ کے حالات میں یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو خاصی تلاش و محنت سے لکھا گیا ہے۔ اگرچہ امام کی عظیم الشان شخصیت اور انکے جلیل القدر کارناموں کو نمایاں کرنے کے لیے تو ایک مبسوط کتاب درکار ہے، اور یہ مختصر رسالہ انکی سیرت نگاری کا حق ادا کرنے کے لیے کسی طرح بھی کافی نہیں ہو سکتا،

تاہم اردو خواں حضرات اس رسالہ سے بھی کسی حد تک اندازہ کر سکینگے کہ امام کس پایہ کے شخص تھے۔

خاکسار تحریک مذہب و سیاست کی روشنی میں | مولانا محمد منظور صاحب نعمانی۔ ضخامت ۱۲۴ صفحات۔ قیمت ۱ر۔ مکتبۂ الفرقان، بریلی۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، مصنف نے اس کتاب میں خاکسار تحریک پر دو حیثیتوں سے بحث کی ہے، ایک یہ کہ جن نظریات اور اصولوں پر اس تحریک کی بنا رکھی گئی ہے وہ دین اسلام سے کہاں تک مطابقت رکھتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ سیاسی حیثیت سے یہ تحریک مسلمانوں کے لیے کہاں تک مفید ہے۔ بحث کا تمام تر مدار خود اس تحریک کے مستند لٹریچر پر رکھا گیا ہے، یا پھر ایسے واقعات پر جو ناقابل انکار ہیں۔ طرز بحث نہایت سنجیدہ اور منصفانہ ہے، اور اگر کوئی شخص واقعی امر حق معلوم کرنے کا خواہشمند ہو تو یہ کتاب اس کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر | مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب۔ ضخامت ۴۳۲ صفحات۔ قیمت قسم خاص مجلد ستے، غیر مجلد عہ۔ قسم عام مجلد عہ، غیر مجلد عہ۔ دفتر الفرقان بریلی۔

الفرقان کو اس سے پہلے حضرت شاہ اسماعیل شہید اور حضرت شیخ احمد سرہندی رحمہما اللہ کے حالات میں دو مستقل نمبر شائع کرنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اب اسی سلسلہ میں اس نے یہ تیسرا نمبر شائع کیا ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی سیرت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ تیسرا نمبر خود الفرقان کے بھی پچھلے دونوں نمبروں سے بازی لے گیا ہے، اور اس حیثیت سے بھی بے مثل ہے کہ شاہ صاحب اور ان کے دور اور ان کے کارناموں کے متعلق نہ تو اتنی معلومات اس سے پہلے کہیں جمع کی گئی تھیں، اور نہ قلیل التعداد اہل علم کے ماسوا اس عظیم الشان شخصیت سے عامۂ خلائق کو کبھی اتنی تفصیل کے ساتھ روشناس ہونے کا موقع ملا تھا۔ اس مجموعہ میں صرف شاہ صاحب کی سیرت ہی بیان نہیں ہوئی ہے، بلکہ تاریخ، عقائد، اصول دین، کلام، فقہ، حدیث اور مختلف موضوعات پر بھی بہت سی بیش قیمت معلومات ضمناً فراہم ہو گئی ہیں جو ناظرین کے لیے انشاء اللہ

ازدیادِ بصیرت کی موجب ہونگی۔

خلافت و سلطنت تالیف ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ قیمت اور مقام اشاعت درج نہیں۔ مولف سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔

یہ اُس مقالہ کا اردو ترجمہ ہے جو مولف نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے لندن یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ اِس کا نام غلط فہمی میں ڈالنے والا ہے۔ آدمی اس نام کو پڑھ کر یہ گمان کرتا ہے کہ شاید اس میں خلافت اور سلطنت کے اصولی فرق و امتیاز کو نمایاں کیا گیا ہوگا۔ مگر دراصل یہ ایک تاریخی مضمون ہے جس میں مسلمانوں کی تاریخ کے اُس خاص دور سے بحث کی گئی ہے جبکہ عباسیوں کی نام نہاد خلافت سیاسی اقتدار سے محروم ہوکر رفتہ رفتہ ایک قسم کی مذہبی پاپائی میں تبدیل ہوگئی تھی اور اُسکے زیر اثر ممالک میں حکمرانی کے عملی اختیارات پر دوسرے متصرف ہورہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اِس دور کی تاریخی و سیاسی تحلیل کرکے یہ دکھایا ہے کہ ایک ہی خطۂ ارضی میں "مذہبی خلافت" اور "سیاسی سلطنت" کے دو مختلف النوع ادارے کس طرح پیدا ہوئے، کس طرح اُنکا ارتقا ہوا اور تین چار سو برس تک اِن کے درمیان کس قسم کے تعلقات رہے۔

موضوع بلاشبہ دلچسپ ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے بہت اچھا تاریخی مواد فراہم کیا ہے، لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ اِس مواد پر بحث کا جو انداز اُنہوں نے اختیار کیا ہے وہ اہل یورپ کے تاریخی ذوق سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اسلام اور اسلامی تاریخ کے نقطۂ نظر سے اُنکی بحث نہ صرف ناقص ہے بلکہ مسائل کو صاف کرنے کے بجائے اور زیادہ الجھا دیتی ہے۔ اگر وہ مغربی مذاق کے بجائے اسلامی مذاق کی رعایت کرتے تو پہلے خلافت کے معنی و مفہوم کو متعین کرتے، پھر واضح طور پر یہ بتاتے کہ عباسیوں سے پاپائی اور قیصریت کے جس مجموعہ پر لفظ "خلافت" کا اطلاق کیا تھا وہ حقیقی اسلامی خلافت سے کس قدر مختلف تھا اور اِن دونوں حقیقتوں کی وضاحت کرنے کے بعد اپنا تاریخی بیان پیش کرتے اس تنقیح

کے بغیر ڈاکٹر صاحب نے جس طرح واقعات کو بیان کیا ہے اُس سے یہ غلط فہمی واقع ہوتی ہے کہ واقعی وہ مذہبی خلافت تھی جس سے آخر کار سلطنت جدا ہوئی۔ حالانکہ دراصل جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ ابتدائی شاہان عباسیہ کی بنائی ہوئی معجون مرکب تحلیل ہوگئی، اسکے ایک جز یعنی پاپائی کو بعد کے عباسی سنبھال کر بیٹھ گئے اور دوسرے جز یعنی قیصریت کو دوسروں نے بانٹ لیا، اور پھر یہ دونوں گروہ مذہبی اصطلاحوں اور مذہبی لباسوں کو محض سیاسی چال کے طور پر استعمال کر کر کے صدیوں تک عوام کو دھوکا دیتے رہے۔

فتنۂ رہبانیت | تالیف جناب مرزا عزیز صاحب فیضانی۔ ضخامت ۴۶۴ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ مرزا محبوب عالم صاحب۔ فیضانی منزل۔ اسلامیہ پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

اس کتاب میں مصنف نے پہلے دنیا پرستی اور ترکِ دنیا کے درمیان اسلام کی راہِ توسط واعتدال کو بیان کیا ہے، پھر رہبانیت کی حقیقت بیان کرنے کے بعد نہایت تفصیلی تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ یہ کن کن شکلوں میں ظہور کرتی ہے اور کس کس طرح انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اثر ڈالتی ہے۔ آخر میں دنیا کو برتنے کے متعلق اسلام کے احکام کی تفصیلات دی ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا طریقہ رہبانیت کے طریقہ سے کس قدر مختلف ہے۔ کتاب نہایت جامع ہے۔ خصوصاً رہبانیت کی مخفی صورتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنے اور اسلام و رہبانیت کے بیشمار مرکبات کا تجزیہ کر کے اصل فتنہ کا سراغ لگانے میں مصنف نے دقیقہ رسی کا حق ادا کر دیا ہے۔

ہندوستان کی کہانی | تالیف مولوی عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی۔ ضخامت ۱۰۷ صفحات۔ قیمت ۱۲ آنے۔ دار المصنفین، اعظم گڈھ۔

اب تک ہندوستان کی تاریخ جس رنگ میں ہندوستانی بچوں کو پڑھائی جاتی رہی ہے اس نے یہاں کے باشندوں کو ایک دوسرے کے لیے درندہ بنا دیا ہے اور انکے درمیان مستقل قومی عداوتوں کے بیج بو دیے ہیں۔ اصلاح حال کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے سامنے اس ملک کی تاریخ ہر قسم کے

زہر سے پاک کر کے مجرد تاریخ کی حیثیت سے پیش کی جائے۔ دار المصنفین اور مولوی عبد السلام صاحب دونوں ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہمارے بچوں کے لیے ایسی ایک بے زہر تاریخ مہیا کر دی ہے کم از کم غیر سرکاری مدرسوں کے لیے تو یہ موقع ہے کہ اس کتاب کو اپنے نصاب میں شامل کریں۔

ابن خلدون مولانا عبد السلام ندوی۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت عہ۔ دار المصنفین، اعظم گڈھ۔

یہ کتاب دراصل ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری کے اس مقالہ کا ترجمہ ہے جو انہوں نے فرانس کی سربون یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کیا تھا۔ اصل مقالہ فرنچ میں تھا۔ پھر اس سے عربی میں ترجمہ ہوا اور اب عربی سے اردو میں منتقل ہوا ہے۔ ابتدا میں مصنف نے ابن خلدون کے ذاتی حالات زیادہ تر اسکی اپنی خود نوشت سوانح عمری سے اخذ کر کے مرتب کیے ہیں، پھر تاریخ و اجتماعیات کے متعلق اسکے فلسفہ کی تشریح و توضیح اور تنقید کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان علوم میں اس مشہور مفکر کا اصلی مقام کیا ہے۔ کتاب اہل ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے، اور فاضل مترجم نے ترجمہ بھی اس قدر رواں اور شگفتہ کیا ہے کہ کتاب پڑھتے وقت کم ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے۔

مفتاح القرأۃ مرتبہ مولانا عبد اللہ رشید مکی صاحب خطیب سورتی جامع مسجد رنگون۔

بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کا جو طریقہ ہندوستان میں رائج ہے اس میں من جملہ بہت سی خرابیوں کے ایک خرابی یہ بھی ہے کہ تجوید کے قواعد کا مطلق لحاظ نہیں رکھا جاتا اور ابتدا سے بچوں کو غلط تلفظ اور غلط لہجہ میں قرآن پڑھنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ مولانا عبد اللہ رشید صاحب نے اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے یہ قاعدہ مرتب کیا ہے۔ چونکہ فاضل مرتب محض ایک ماہر فن قاری ہی نہیں ہیں بلکہ انہیں تعلیم کا بھی بہت طویل تجربہ ہے اسلیے قاعدہ کی ترتیب ایسی اچھی ہے کہ اب تک اس سے بہتر قاعدہ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ ابتدا میں استادوں کی ہدایت کے لیے طریق تعلیم کی کافی توضیح کر دی گئی ہے، اور قاعدہ کے دوران میں بھی اکثر اسباق کی مشق کرانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ دراصل یہ قاعدہ بچوں کے لیے نہیں بلکہ استادوں کے لیے لکھا گیا ہے۔

تذکرہ شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ

(یعنی قیمتی اضافات اور نہایت مفید ترمیمات کے ساتھ)

مشہور دینی ماہنامہ "الفرقان" بریلی کے

"شاہ ولی اللہ نمبر" کا

دوسرا کتابی اڈیشن

جس کی تیاری میں

ادارہ "الفرقان" کے علاوہ ملک کے منتخب علمائے کرام اور ممتاز اہل قلم و ارباب تحقیق نے بھی خاص حصہ لیا ہے
جنکے اسمائے گرامی صفحات مابعد کی فہرست مضامین سے معلوم ہو سکتے ہیں

افادیت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے

کہ اسکا پہلا اڈیشن نوری سلسلہ ۱۹۴۱ء میں شایع ہوا تھا جو صرف پندرہ دن میں ختم ہو گیا، اب شائقین کے بیحد اصرار پر یہ دوسرا کتابی ایڈیشن تیار کرایا گیا ہے جو بہر حیثیت پہلے ایڈیشن سے زیادہ مکمل و بہت فائق ہے۔ مگر کاغذ وغیرہ کی گرانی کی وجہ سے اس مرتبہ بہت تھوڑی تعداد میں تیار کرایا گیا ہے اور توقع ہے کہ یہ بھی بہت جلد ہی ختم ہو جائیگا۔ لہذا شائقین فرمائش بھیجنے میں تاخیر نہ فرمائیں

اسمیں کیا کیا ہے؟ اگرچہ بظاہر اس کا تعلق صرف حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ سے ہے لیکن فی الحقیقت یہ

تاریخی معلومات، سیاسی نکات، مذہبی معارف اور دینی ہدایات کا بحر زخار ہے

مختلف قسم کے مذہبی و سیاسی اور علمی و تاریخی مباحث کے متعلق اس دوسرے ایڈیشن میں قریباً ساڑھے تین سو عنوانات ہیں جنکے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ کے ارشادات اور طریق عمل کی روشنی میں ہمیں بحث کی گئی ہے۔ ان عنوانوں میں سے قریباً ڈیڑھ سو عنوان ناظرین کے ملاحظہ کیلئے یہاں بھی درج کیے جا رہے ہیں۔ تاکہ اسکی اہمیت اور جامعیت کا کچھ اندازہ آپ کر سکیں

نظمیں اور فوٹو بلاک:۔ حضرت شاہ صاحب کے متعلق بلند پایہ شعراء کی وجد آفریں نظمیں اور آپکے دست خاص کی لکھی ہوئی دو تاریخی تحریروں کے فوٹو، نیز آپکے مزار مبارک اور حضرت شاہ عبدالرحیم و شاہ عبدالعزیز کے مزارات کے فوٹو، اور اکبر آبادی مسجد کا فوٹو جو حضرت شاہ اسحٰق صاحب کی آخری اقامت گاہ تھی لیکن آج اس کا نشان بھی موجود نہیں، اس مجموعہ میں آپ ملاحظہ فرمائینگے، یہ سب فوٹو قیمتی آرٹ پیپر پر ہیں۔ ٹائٹل سہ رنگا نہایت حسین اور باصرہ نواز ہے جو بلاکوں سے نہایت اعلیٰ قسم کے آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے کہ جس کی نظیر اس وقت ہندوستان میں مشکل سے ہی مل سکتی ہے۔ قیمت وغیرہ کی تفصیلات آخری صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے۔

ناظم الفرقان بریلی۔ یو۔ پی

تذکرۂ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے

ساڑھے تین سو عنوانوں میں سے صرف ڈیڑھ سو عنوان یہ ہیں

حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مدظلہ کی تالیفت
ارشاد گرامی۔ از حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ
ہندوستان میں قرآن فہمی کا چرچا اور شاہ ولی اللہؒ
(از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر صدق)
شاہ صاحب سے پہلے ہندوستان میں اسلام کی سرگزشت
(از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی)
(اس مقالہ کے چند ضمنی عنوانات یہ ہیں)
عرب اور مغل فاتحین اور ان کا باہمی فرق
دسویں صدی ہجری سے پہلے اسلام کی عام حالت
ہمارے سلطنتیں مصلحین اور خدام دین
محمد تغلق اور خدمت دین
فیروز تغلق کی مساعی اصلاح
سکندر لودھی کی اصلاحات
دور ضلالت یا عہد اکبری
حضرت مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ
شیخ عبدالحق کی دینی خدمات
عالمگیر اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد
امام ولی اللہ دہلوی کا ظہور
منصب تجدید کی حقیقت اور
تاریخ تجدید میں شاہ ولی اللہؒ کا مقام
(از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)
[اس مقالہ کے چند ضمنی عنوانات یہ ہیں]
اسلام اور جاہلیت کی اصولی و تاریخی کشمکش،
جاہلیت کی اقسام اور جاہلی نظریات
اسلام کا نظریہ تمدن،

نبی کے کام کی نوعیت
جاہلیت کا حملہ
کار تجدید کی نوعیت اور اس کے چند شعبے
مجددین کے کارنامے
حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تجدید دین
ائمہ اربعہ کا تجدیدی کارنامہ
امام غزالی کی مجددانہ مساعی
امام ابن تیمیہ کا جہاد تجدید
امام ربانی مجدد الف ثانی کا تجدیدی کام
حضرت شاہ ولی اللہ کا کام اور پیغام
حضرت سید احمد اور شاہ اسمٰعیل شہید
تحریک جہاد کی ناکامی کے اسباب
عہد حاضر میں کار تجدید کی ضرورتیں
اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں خدا کا
ایک وفادار بندہ
(از مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ)
(یہ مقالہ ۲۰۰ صفحات پر ہے اور اس میں سو
سے زیادہ ضمنی عنوانات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں)
الف ثانی کے تجدیدی کارنامہ کی انتہا
عہد عالمگیری کے بعد فتنوں کا زور
شاہ عبدالعزیز کے خونی آنسو
دلی کے خونی فتنے اور شاہ ولی اللہ کی استقامت
سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک
مسلمانوں پر لرزہ خیز مظالم
نظریہ تقسیم ہند یا پاکستانی اسکیم

انسانوں کے ہیولے
مرہٹہ تحریک کا نصب العین
دلی کے لال قلعہ پر مرہٹوں کا قبضہ
حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ایک تاریخی خواب،
خواب کی تعبیر اور پانی پت کی تاریخی جنگ،
غازی ابدالی کا حملہ اور مرہٹہ طاقت کی شکست،
پھر مسلمانوں کی غفلت اور شاہ صاحب کی طرف سے
خطوط کا مسلسل الارم
مسلمانوں کے مختلف طبقات کو شاہ صاحب کا
پیغام اور مفصل پروگرام
سلاطین اسلام سے شاہ صاحب کا خطاب
امرا اور ارکان دولت سے خطاب
فوجی سپاہیوں سے خطاب
اہل صنعت و حرفت سے خطاب
پیروں اور پیرزادوں سے خطاب
غلط کار علما سے خطاب
واعظوں اور زاہدوں سے خطاب
عام امت مسلمہ سے جامع خطاب
ہندی مسلمانوں کا جمود یا مرنے کا تہیا
خواب غفلت کی سزا، انگریزوں کا تسلط
کارتوسی بندوقوں کے ساتھ لارڈ کلائیو کا پہلا حملہ
میر جعفر وغیرہ کی غداری
سراج الدولہ کا لرزہ خیز قتل
مرشد آباد کے بازاروں میں سراج الدولہ کی لاش
بنگال بہار و اڑیسہ کی دیوانی کمپنی بہادر کے نام

فرنگی تجارتی اداروں کی دوامی نزاکت
آخر عمر میں شاہ ولی اللہؒ کی دردناک وصیت
شاہ صاحب اور نظریہ وطنیت
شاہ صاحب کے زمانہ میں علما و مشائخ کی افسوسناک حالت
ام الفتن - یعنی خانہ جنگی
سادات بارہ کا فتنہ اور اس کے نتائج
شہزادہ فرخ سیر کا بیدردانہ قتل
رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کی تخت نشینی
محمد شاہ کا دور دورہ اور رنگ رلیاں
دلی پر خونی نادر کی یلغار
سیاسی شکست کا لازمہ دماغی غلامی
علماء ہند پر منطق و فلسفہ کے تسلط کی تاریخ
ہندوستانی علماء پر ایرانی علوم و نظریات کا اثر
ہندوستان میں دہلیہ پٹھانوں کا سیلاب سیاسیہ
ہند میں ان کا دخل اور حصہ
اس افراتفری کے زمانہ میں شاہ ولی اللہ کی آمد
تھوڑی سی عمر میں شاہ ولی اللہ کے محیر العقول کارنامے
سیاست اور اسلام کا واقعی تعلق آپکی نظر میں
فقہی اختلافات میں نقطۂ عدل
صوفیائے عصر اور تصوف کی اصلاح
یونانی فلسفہ کی بجائے ایمانی فلسفہ
مغربی الحاد کے زہر کا تریاق
خواب میں شاہ صاحب کو رسول اللہ کا قلم عطا ہوا،
شاہ صاحب کی اویسیت
شاہ صاحب کے باقیات صالحات اولاد و احفاد،
ولی اللہی دار العلوم کا حال اور "غدر" میں اسکی
بربادی۔

امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا تعارف
(از حضرت مولانا سندھی مدظلہ)
[یہ بے نظیر علمی مقالہ نو سے صفحے پر حاوی ہے اس میں
ستر سے زیادہ ضمنی عنوانات ہیں جنمیں سے چند یہ ہیں]
شاہ عبدالرحیم، اور ان کے اساتذہ و مشائخ
شاہ ولی اللہ کی ذہنیت کا بنیادی مسئلہ
علوم قرآن اور شاہ صاحب رح
مضامین قرآن کی ولی اللہی تقسیم
مسئلہ حقیقت روح اور شاہ صاحب
آیات متشابہات کے متعلق آپکا مسلک
مسئلہ ناسخ و منسوخ اور شاہ صاحب
شاہ صاحب اور مقصد قرآن کی تعیین
مسئلہ ربط آیات اور شاہ ولی اللہ رح
قرآن اور سنت کا باہمی تعلق
اجماع کا استناد قرآن سے
علوم حدیث اور شاہ ولی اللہ رح
کتب حدیث پر شاہ صاحب کی تنقید و طبقاتی تقسیم
مولانا نانوتوی کی عقلی تشریح
ائمہ حدیث کے طبقے اور انکی خصوصیات
صحیح و ضعیف حدیثوں میں امتیاز کا ملکہ پیدا
کرنیکا ولی اللہی طریقہ
شاہ ولی اللہ رح اور علم فقہ
تطبیق الفقہ والحدیث
حجازی و عراقی فقہ کی تدوین
تدوین فقہ اور ہندوستان
شاہ صاحب کا تحقیقی فقہی مسلک
حنفیت میں شاہ صاحب کی الہامی تجدید
شاہ صاحب بحیثیت مجتہد منتسب

شاہ عبدالرحیم کا حنفی طریقہ
شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ
مشائخ دیوبند اور حنفیت
تصوف و فلسفہ اور شاہ ولی اللہ رح
عجمی اقوام اور فلسفۂ اشراق
اسلام اور ہندوستانیت
شاہ صاحب کی نظر میں تصوف کی اہمیت
اخلاق و روحانیت اور اقتصادیات

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ایک خاص نظریہ
علم الاخلاق اور علم المعیشت کا باہمی ربط
(از مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی)
ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال کا سبب
شاہ صاحب کی نظر میں
(از حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ)
انقلابی یا مجدد؟
(از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم۔ اے)
حضرت شاہ ولی اللہ رح بحیثیت مصنف
(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)
شاہ صاحب کا ایک علمی ماخذ (ابن تیمیہ)
(از جناب مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی)
شاہ ولی اللہ اور چند سیاسی نکات
(از مولانا ابوالنظر صاحب رضوی امروہوی)
حضرت شاہ ولی اللہ اور حنفیت
(از جناب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری)
حضرت شاہ ولی اللہ رح اور تقلید
(از جناب مولانا خیر محمد صاحب جالندھری)

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

دورِ جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروانِ اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروجِ اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدھا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فردِ جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بےجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ ترجمان القرآن۔ لاہور

صرت مرمد قی پرنٹنگ پریس نیل روڈ لاہور میں طبع ہوا